مئی 88ء

قد افلح من تزکّٰی ۝ و ذکر اسم ربہ فصلّٰی (القرآن الکریم)

وہ فلاح پا گیا جس نے تزکیہ کر لیا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پھر نماز کا پابند ہو گیا۔

المجاھد من جاھد نفسہ (الحدیث) مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف جہاد کرے

ماہنامہ

المرشد

چکوال

بیاد

شیخ العرب والعجم، صدیق دوراں، مجدد طریقت، مجتہد فی التصوف، بحر علوم شریعت، قلزم فیوض و برکات، امام اولیاء، شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ حضرت العلام اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ

مقام اشاعت

دار العرفان ○ منارہ ○ ضلع چکوال

بانی: حضرت العلام مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

سرپرست
حضرت مولانا محمد اکرم اعوان
مدظلہ العالی

جلد: ۹

ماہنامہ
المرشد

رمضان المبارک
۱۴۰۸ھ

شمارہ: ۹

مئی
۱۹۸۸ء

دار العرفان
منارہ
ضلع چکوال

مدیر مسئول
پروفیسر حافظ عبد الرزاق
ایم اے (اسلامیات)، ایم اے (عربی)

مدیر
تاج رحیم

اس شمارے میں

اداریہ	۲
تخیر کائنات	۳
التب	۶
اعجاز قرآنی	۹
کیمیاگر	۱۹
سفرنامہ	۲۵
میں یہاں تک کیسے پہنچا	۲۹
خطبۂ جمعۃ الاولیٰ	۴۰
حضرت امام شافعی	۴۸
دیکھتا چلا گیا	۵۲
اس سادگی پہ	۵۵

بدل اشتراک

چندہ سالانہ	۷۵ روپے
ششماہی	۴۰ روپے
فی پرچہ	۷ روپے

بیرون ممالک کیلئے سالانہ چندہ

سعودی عرب، کویت، سری لنکا، بھارت	۱۷۰ روپے
متحدہ عرب امارات، مسقط	۱۸۰ روپے
یورپ — ۲۰۰ روپے، لیبیا — ۲۰۰ روپے	
امریکہ، کینیڈا	۲۲۵ روپے
تاحیات	۱۰۰۰ روپے

سول ایجنٹ:
اویسیہ کتب خانہ
الوہاب مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

طابع و ناشر: حافظ عبد الرزاق ○ مطبوعہ: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور ○ مقام اشاعت: دار العرفان منارہ، ضلع چکوال

اداریہ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ

کلامِ باری عزّ اسمہٗ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ نہ صرف خود اعلیٰ درجے کے تقدس کا حامل ہوتا ہے بلکہ اسے سننے کے لیے بھی تقدس کا ایک خاص درجہ ضروری ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جو کلام باری سے مشرف ہوتے ہیں وہ معصوم عن الخطا ہوتے ہیں۔ دنیا میں ایسے نیک اور پاکیزہ افراد بھی ہوتے ہیں جو ساری زندگی کبھی کوئی گناہ نہیں کرتے مگر ان میں گناہ کرنے کی سکت موجود ہوتی ہے، ایسے حضرات کو محفوظ عن الخطا تو کہا جاتا ہے معصوم نہیں۔ معصوم وہ ہستی ہوتی ہے جس میں گناہ کرنے کی ذرہ بھر استعداد بھی موجود نہ ہو اور نوعِ انسانی میں یہ شرف صرف اور صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو نصیب ہوتا ہے۔ ان ہستیوں پہ تو کلام آلٰہی کا نزول ہوتا ہے مگر وہ صرف اُن کی ذواتِ مقدسہ کے لیے نہیں ہوتا بلکہ انسانیت کے استفادہ عام کے لیے ہوتا ہے۔ سو اس کے معانی و مفاہیم جاننے کے لیے بھی ایک خاص درجے کی پاکیزگی مطلوب ہے۔ جن ایام میں ان مبارک کلام کا نزول ہوتا ہے۔ انھیں بھی ایک خاص درجہ تقدس کا حاصل ہوتا ہے۔ سو یہ رمضان المبارک وہ مقدس مہینہ ہے جس کو یہ شرف نصیب ہوا کہ کلام باری بارگاہِ صمدیت سے بیت العزۃ میں جو آسمان اوّل پہ ہے نازل ہوا اور وہاں سے بحکم آلٰہی تئیس برسوں میں بتدریج مکمل ہوا۔ اب ان لوگوں کو جن کے لیے یہ مبارک کلام نازل ہوا بھی تقدس کا ایک خاص مقام چاہیے تھا کہ وہ اس سے کما حقہٗ فائدہ حاصل کر سکتے۔ سو اللہ کریم نے اس ماہِ مبارک میں جہاں رحمتوں کے دروازے کھول دیئے بخشش عام کر دی وہاں کمال اطاعت کے اظہار کے لیے روزہ فرض کر دیا۔ ویسے تو سارا سال ایک مسلمان کھانے، خرچ کرنے، دوستی دشمنی تعلقات و عبادات میں اطاعت آلٰہی کا رنگ ہی لیے ہوتا ہے مگر اس ماہِ مبارک میں تو ایک خاص وقت سے مقررہ وقت تک حلال کھانے پینے سے بھی رک جاتا ہے اور اسے اللہ کریم کا ایک خاص قرب نصیب ہوتا ہے جس کی دو وجہیں ہیں کہ نہ کھانا پینا اوصافِ ملکوتی میں سے ہے یعنی یہ فرشتوں کی صفت ہے اور اس کے باعث ارشاداتِ باری کو قبول کرنے کی استعداد نصیب ہوتی ہے۔ دوسرے روزہ دار کو اللہ کریم سے ایک خاص حضوری حاصل ہوتی ہے مثلاً دوپہر کی گرمی ہے، پیاس کی شدت ہے، ٹھنڈے پانی کا گھڑا رکھا ہے، کمرے میں کوئی دوسرا انسان موجود نہیں مگر یہ پانی اس لیے نہیں پی رہا ہے کہ اس کا اللہ، اس کا معبود برحق، اس کے پاس موجود ہے۔ ایک بار میں ایک جوہڑ کے کنارے کھڑا تھا جو کچی سڑک کے ساتھ تھا۔ ظہر کا وقت اور رمضان کا مہینہ تھا۔ ایک گڈریا آیا، بھیڑوں کا گلہ پانی پہ ٹوٹ پڑا مگر اس نے سر سے وہ چادر اتاری جس کا گٹھڑ سا بنا کر سایہ بنا رکھا تھا، وضو کیا اور اللہ کریم کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ اسے خیال بھی نہ گزرا کہ چند گھونٹ پانی پی لوں کیوں؟ اس لیے کہ اس کے رب نے اسے اجازت نہیں دی تھی۔ اور اس کا رب اس کے پاس موجود تھا۔ یہ حضوری بھی قبول حق کی استعداد پیدا کرتی ہے۔

اور اس کے ساتھ روزہ صرف بھوکا پیاسا رہنے کا نام نہیں بلکہ زبان کو جھوٹ اور بدکلامی سے روکنے کا نام ہے۔ حدیث پاک کا مفہوم ہے اگر تمھیں کوئی گالی بھی دے تو کہہ دو میں روزہ سے ہوں۔ ایسے ہی کانوں کو فحش سننے سے روکنا، نگاہ کو غلط نگاہی سے بچانا اور اپنے اعمال کو نافرمانی سے محفوظ رکھنے کا نام روزہ ہے۔ روزہ کا معنیٰ لگام کھینچ لینا ہے، روک لینا ہے، اپنی ساری کوشش سے، اپنی ساری قوت سے اپنے آپ کو ان حدود کے اندر پابند کر لینا جہاں رحمت آلٰہی پوری شدت سے دلوں کو جل تھل کئے دے رہی ہے، جہاں نفل کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ثواب کم از کم ستر گنا ہے۔ جس کے ایک دن کا روزہ جس کی ایک رات کا قیام ساری زندگی کی خطاؤں کو بہا لے جاتا ہے بشرطیکہ دلی کیفیات اور اندرونی جذبات اس کا ساتھ دے رہے ہوں۔ جس مبارک مہینے میں ایک عشرہ ایسا بھی ہے کہ جسے فرصت ہو ساری کائنات سے کٹ کر صرف رب کریم سے لو لگا کر بیٹھ جائے۔ اسی کے گھر میں، کسی گوشے میں، کسی کونے میں، اور سوائے اللہ کے تب تک کسی سے بات نہ کرے جب تک ضروری نہ ہو، تب تک باہر نہ نکلے جب تک مجبوری نہ ہو، پھر اُس کی قدرت کا تماشا دیکھے۔ مگر حضور قلبی شرط ہے۔ کسی صاحبِ دل کی صحبت اور نظر بھی کبھی نصیب ہوئی ہو۔ یہاں ایک رات ایسی ہے جو ہزاروں مہینوں پر بھاری ہے۔ مگر یاد رکھو دل ساتھ لے کر بیٹھنا ورنہ اداکاری ہو گی عمل نہیں۔ اور نتائج عمل پہ مرتب ہوتے ہیں اداکاری پہ صرف چند سکے اور باقی تالیاں۔

اللہ کریم سب مسلمانوں کو رمضان المبارک کی برکات نصیب فرمائے اور عالم اسلام کی ہر حال اور ہر مصیبت میں نگہداشت فرمائے۔

فقیر محمد اکرم

اسرار التنزیل

تسخیر کائنات

حضرت شیخ المکرم مولانا محمد اکرم مدظلہ العالی

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ

ترجمہ: "کیا تم نے نہیں دیکھا جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو خدا نے تمہارے قابو میں کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں اور بعض لوگ ایسے ہیں کہ خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں علم رکھتے ہیں ہدایت اور نہ کتاب روشن"

یہ سورۃ لقمان کی آیہ نمبر ۲۰ ہے اور من جملہ دیگر احسانات کے جن کا شمار تک ممکن نہیں یہاں ایک خاص احسان اور کرم کی نشاندہی فرمائی ہے کہ اللہ کریم نے اس مخلوق کو جو آسمانوں میں ہے اور تمہاری رسائی اس تک ہے جیسے چاند سورج سیارے بادل وغیرہ۔ کہ جو چیزیں بھی بلندی میں ہیں انہیں محاورۃً آسمان میں ہی کہہ دیا جاتا ہے مسخر کر دیا ہے اور جو زمین میں ہے اس کو بھی۔ یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں تم پر انڈیل دی ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ سب کچھ جو بھی انسانی زندگی یا انسانیت کے کام آسکتا ہے اللہ کریم کی طرف سے انسان کے لیے اور خصوصاً مومن کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے اب یہ اس کے ذمے ہے کہ ان کا طریق استعمال دریافت کرتا چلا جائے۔ اور ان چیزوں کو انسانیت کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور کار آمد ثابت کرنے میں بھرپور کردار ادا کرے۔

جس قدر ایجادات سامنے آتی ہیں اگر نور سے دیکھا جائے تو موجد صرف اور صرف طریق استفادہ دریافت کرتا ہے ورنہ وہ اشیاء پہلے سے موجود ہوتی ہیں اور ان میں وہ خصوصیت بھی مثلاً مصنوعی بارش کو لے لیجیے تو ایک خاص قسم کی گیس ایک خاص انداز سے فضا میں چھوڑی جاتی ہے جو فضا میں موجود گیسوں کے ساتھ مل کر بارش کا سبب بن جاتی ہے تو کیا یہ گیس یا دوسری گیسیں انسان نے بنائی ہیں؟ یا ان میں خصوصیات انسان نے پیدا کی ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ انسان نے صرف ان سے استفادہ کا طریقہ دریافت کر لیا۔ اور بس۔ ایسے ہی تمام ایجادات کا تجزیہ ہمیں اسی نتیجہ پر پہنچائے گا۔ موٹر ہو یا ہوائی جہاز۔ ان میں جو کچھ بھی استعمال ہوا ہے اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں انسان نے کوئی خصوصیت پیدا کر دی ہو بلکہ اشیاء بھی تھیں اور ان میں یہ اوصاف بھی تھے۔ جیسے جیسے انسان ان کا طریق استعمال دریافت کرتے چلے گئے وہ انسانیت کی خدمت کے لیے استعمال ہونا شروع ہو گئیں۔ یہ سب چیزیں اس وقت بھی موجود تھیں جب لوگ پیدل چلا کرتے تھے فرق صرف یہ تھا کہ ان کے استعمال سے آگاہی نہ تھی اسی لیے آپ جب جدید ایجادات کے ابتدائی ایام تلاش کرنا چاہیں گے تو آپ کو سب سے پہلے مسلمان ہی اس میدان میں دکھائی دیں گے۔ اور بہت بڑی بڑی ایجادات کی بنیاد ان اشیاء

اور ان کلیات پر نظر آئیں گی جن کی دریافت کا سہرا مسلمان مفکرین اور ماہرین کے سر ہے۔ اس کی وجہ نورِ ایمان ہے۔ کہ جب یہ دل میں جاگزین ہوتا ہے تو اپنے اندر اور اپنے اردگرد وہ کچھ نظر آیا ہے جو پہلے اس کی فکر کی رسائی میں نہ تھا۔ یا اس کی نظر میں وہ بہت غیر اہم بات تھی۔ میں یہاں صرف ایک واقعہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مضمون کو لمبا کرنا مقصد نہیں۔ محض بات سمجھانا مراد ہے۔ اور وہ یہ کہ جب محمد بن قاسم کے قتل کا حکم صادر ہو گیا اور اگلی صبح اسے شہید کیا جانا تھا تو داروغہ جیل یہ ظلم برداشت نہ کر سکا اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر دل و دماغ کی کش مکش میں دل کی جیت ہوئی اور وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھا کہ اس مایہ ناز جرنیل اور فاتح کو سلیمان بن عبدالملک کی تلوار کا لقمہ نہیں بننے دوں گا وہ جیل پہنچا دروازہ کھلوایا اور آدھی رات کو جب محمد بن قاسم کی کوٹھری کے دروازے پر پہنچا۔ تو دیکھا کہ وہ دروازے کے جنگلے کے ساتھ لگے بیٹھے ہیں اور کاغذ پر جلی ہوئی تیلیوں کے سرے سے لکیریں کھینچ رہے ہیں بہت حیران ہوا "یا امیر یہ کیا ہے" فرمایا "میں نے نئی منجنیق کا نقشہ سوچا ہے اگر اس طرح بنائی جائے تو اس کی کارکردگی بڑھائی جا سکتی ہے"۔ یہ ایک جنگ میں استعمال ہونے والا ہتھیار تھا جو دشمن کے قلعوں پر سنگ باری کے کام آتا ہے یا آپ بغیر بارود کے چلنے والی ابتدائی دور کی توپ کہہ لیجئے۔ تو اس نے کہا "آپ کو تو علی الصبح شہید کر دیا جائے گا پھر آپ یہ کس لیے محنت کر رہے ہیں"۔ تو فرمایا "یہ امتِ مسلمہ کے لیے ہے میری موت امت کی موت نہیں اور امور امت تو رواں دواں رہیں گے" اس نے کہا "میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کو آزاد کر دوں اور روپوش ہو جائیں یقیناً آزاد ہو کر آپ اپنی حفاظت کر سکیں گے اور آپ کے گرد اتنے جاں نثار جمع ہوں گے کہ خلیفہ وقت آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا فرمایا" شکریہ دوست لیکن اگر میں یہ کرنا چاہتا تو خلیفہ مجھے ہندوستان سے گرفتار ہی نہ کروا سکتا۔ مگر جانتے ہو نتیجہ کیا ہوتا ایک میری جان بچانے کے لیے مسلمان دو دھڑوں میں بٹ جاتے اور آپس میں کشت و خون کا بازار گرم ہو جاتا جو نہ جانے کتنی ماؤں کی گود اجاڑتا اور کتنی سہاگنوں کا سہاگ لوٹتا۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا کہ مسلمان آپس میں لڑ کر کفر کے مقابلے میں کمزوری کا شکار ہو جاتے یہ بہت مہنگا سودا ہے میرے بھائی اس پر محمد بن قاسم ہی کی قربانی دی جائے گی آپ جا کر سو جائیں"۔

یعنی مومن اس حال میں بھی ایجادات کا فریضہ ادا کر رہا ہے امتِ مسلمہ کے لیے اور انسانیت کی خدمت کے لیے، مگر یہ ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے۔ اس کا ایمان اس درجہ مضبوط ہے کہ اپنی جان کا نذرانہ دے کر بھی ملت کی خدمت کا حق ادا کر رہا ہے۔

یعنی علوم جدیدہ کا حصول مسلمانوں کا فریضہ ہے اور نئی ایجادات کو مفید مشہود پہ لانا ان کا کام۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھیں۔ اور یہ یاد رکھیں کہ ہم اول آخر مسلمان ہیں اور یہ سارے انعامات ہمارے ہی رب نے بخشے ہیں۔

بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے وہ نوجوان اور وہ ماہرین جو اس میدان میں سرگرم عمل ہیں وہ اسلام اور اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ میں نے اپنے امریکہ کے سفر میں یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ جس قدر تحقیقی ادارے ہیں سب میں مسلمان اور بالخصوص پاکستانی مسلمان موجود ہیں۔ مگر وہ اسلام سے صرف نام کی راہ و رسم رکھتے ہیں حالانکہ حق یہ تھا کہ جس قدر ایجادات سامنے آ رہی تھیں، جذباتِ تشکر بھی اسی قدر ترقی کرتے۔ ایک طبقہ دوسری طرز فکر رکھتا ہے اور وہ ان اشیاء اور باتوں پر سوائے فتویٰ دینے کے اور کچھ کر نہیں پاتا یعنی سائنس دان تو چاند کی مٹی کے اجزاء پہ بحث کر رہا ہے اور ہم بجائے سمجھنے کے محض اسے اپنے فتوے کی زد میں لا کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ٹیلی وژن ہی کو لیں۔ ایک آلہ ہے جس کے ذریعے آپ چند لمحوں میں پورے ملک یا پوری دنیا سے مخاطب ہو سکتے ہیں اب فتوے سے کیا ہو گا۔ کہ آپ ناراض ہو کر بیٹھ جائیے اور یہ قوت مخالف طاقتوں کے ہاتھ میں دے دیجئے یہ تو ہونے سے رہا کہ یہ دنیا سے ختم کرا دیئے جائیں کوئی بھی چیز اپنی ذات میں بھلی یا بری ایجاد نہیں۔ اس کا استعمال ہی اس کی بھلائی یا برائی کا سبب بنتا ہے۔ تو میری ناقص رائے میں مسلمانوں کو علوم جدید میں خصوصی توجہ دینی چاہیے کہ بحیثیت قوم اقوامِ عالم کی صف میں سربرآوردہ ہوں۔ مگر جہاں آسمانی قوتیں، سورج، اس کی دھوپ گرمی، چاند کی چاندنی، وغیرہ یا زمین کے خزانے ان کے زیر استعمال

ہوں یہ ان کے استعمال کے قاعدے دریافت کریں، وہاں وہ باطنی دولت بھی سمیٹیں جو اسی رب العلمین نے ان کو عطا فرمائی ہے، جس نے یہ ظاہر کے خزانے لٹائے ہیں اور وہ باطنی دولت نورِ ایمان ہے وہ روشنی جس میں اللہ کا جمال نظر آتا ہے، وہ احساس جو اللہ کو اپنے پاس محسوس کرتا ہے، وہ یادِ جوالله کو دل میں بسا لیتی ہے، جس کے نتیجے میں انسانی اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے، انسانوں کا کردار بنتا ہے، اور جس کی روشنی میں نام کا انسان واقعی انسان بنتا ہے جس قدر یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کو علوم جدیدہ میں دسترس ہو اس سے زیادہ ضروری یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہوں۔ ان کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہے، اور قربِ الٰہی ان کی منزل ہو یعنی وہ مسلمان بھی رہیں اور نئے ایجادات کا ایک نقصان بھی ہے کہ آدمی اسباب کو جان لینے کے بعد مسبب الاسباب کو بھولنے لگتا ہے اور خود اللہ کی ذات پہ اعتراضات کا سلسلہ چل نکلتا ہے، جس کے نتیجے میں دہریت وجود میں آتی ہے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ کائنات کے رازوں کو سلجھانے کے لیے صرف اور صرف عقلِ انسانی کی ضرورت ہے اور بس اسی لیے کافر بھی بڑی سے بڑی ایجاد کی دریافت کر سکتا ہے مگر خود اپنی دریافت کے لیے ایمان کی ضرورت ہے اسی لیے آپ کسی بھی موجد یا سائنس دان کی زندگی کے متعلق پاکیزگی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ بلکہ عموماً اس کے برعکس ہی ملے گا، ہاں اگر عقل کو بھی کام میں لایا جائے اور ساتھ نورِ ایمان نصیب ہو تو پھر نہ صرف بہترین سائنسدان یا بہترین فلسفی ہوگا بلکہ بہترین

انسان بھی ہوگا۔ اور اس کی اندرونی دنیا بھی آباد ہوگی۔ دل کے چمن میں بھی بہار ہوگی "بغیر خزاں کے" اور پھول کھلیں گے بغیر کسی کلچین کے اندیشہ کے، لیکن اگر یہ نعمت نصیب نہ ہوئی تو پھر ان سائنسی کمالات کا انٹرالٹ بھی ہو سکتا ہے۔ نہ صرف انسانی زندگی ویران ہوگی، اس کا دل اجڑے گا نہ صرف اللہ سے بیگانہ ہوگا بلکہ اسے ذاتِ باری پہ اعتراض بھی ہوگا۔ حالانکہ اس کی ذات پر بات کرنے کے لیے صرف دماغ کافی نہیں علم کی ضرورت ہے وہ علم جو علمِ ہدایت ہو، وہ علم انبیاء کا عطا کردہ ہو، جسے واقعی علم کہنا چاہیے۔ کہ سب علوم محض معلومات کی حد تک رہتے ہیں وہ آدمی

فرمایا: ایک حدیث شریف میں ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب لوگ صبح سے شام تک دنیا کمانے کی فکر میں لگے رہیں گے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ لوگ رات دن دنیا کمانے میں مستغرق رہتے ہیں۔ اس بات کی کوئی فکر یا پرواہ نہیں ہے کہ دین ہے یا چلا جائے۔ پھر فرمایا: دنیا کی کثرت بذاتِ خود بری شے نہیں، بشرطیکہ یہ ہاتھ میں ہے اور دل میں جاگزیں نہ ہو جائے یعنی اس کو آخرت سنوارنے کے لیے کام میں لایا جائے نہ کہ اس کی وجہ سے آخرت برباد ہو۔

نہ مرد است آں کہ دنیا دوست دارد
اگر دارد برائے دوست دارد

حضرت مولانا اللہ یار خانؒ

کا حال نہیں بنتے۔ مگر انبیاء جو چیز حاصل فرماتے ہیں وہ حال بن جاتا ہے اس لیے وہ علم پھلتا ہے اور اس کیلئے کتاب روشن کی ضرورت ہے ایسی کتاب جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہو جو اس کا نبی یا اس کا رسول لایا ہو جس میں اس کی باتیں ہوں، اس کا پتہ ہو، وہ کتاب جو روشنیاں بکھیرتی ہو، تو اس کے طفیل اس کی بارگاہ تک بھی رسائی ممکن ہے اور اس کی ذات کا قرب بھی،

مگر لوگ نادانی میں ان سب چیزوں سے تہی دامن، محض اپنے چند سائنسی تجربات کو اتنا اہم جاننا شروع کر دیتے ہیں کہ اپنے تجربوں، اپنے مطالعہ اور اپنی عقل کو بنیاد بنا کر، بحث کا کا دائرہ ذاتِ باری تک بڑھا دیتے ہیں۔ سو حاصل کلام یہ ٹھہرا کہ مسلمان کو جدید علوم میں بھی دوسروں کی نسبت بہت زیادہ آگے بڑھنے کی ضرورت ہے مگر اسلام کو چھوڑ کر نہیں، بلکہ علوم اسلامیہ کو بھی پہلو بہ پہلو ساتھ لے کر چلتے ہوئے۔

اللہ کریم مسلمانوں کو زندگی کے ہر میدان میں ترقی دے

"آمین"

اللہ کے فضل و کرم سے استاد المکرم حضرت مولانا محمد اکرم اعوان بلند ہمت اور اولوالعزم شخصیت کے مالک ہیں۔ عام جسمانی تکالیف کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق آپ کو ذیابیطس کی تکلیف ہو گئی ہے۔ جس کیلئے انکو مکمل آرام کی ہدایت کی گئی ہے۔ اسکے باوجود وہ نہ صرف اندرون ملک طویل سفر کر رہے ہیں بلکہ غیر ممالک کیلئے بھی پروگرام میں تبدیلی نہیں کی ہے۔ وہ ہر حال میں اس مشن کو دنیا کے ہر دور دراز گوشے تک لیجا رہے ہیں جو حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ انکے سپرد کر گئے ہیں جس کیلئے اللہ تبارک تعالیٰ نے انکو یہ قوت بخشی ہے اور جن کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر رحمت ان پر ہے۔ جسمانی تکلیف بہرحال ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ ان کی اس تکلیف کا علم جب ساتھی بھائی اور بہنوں کو ہوا ہے انکے دلوں پر کیا گزری اور کیا گزر رہی ہے۔ شاید وہ اس تکلیف سے کم تکلیف دہ نہیں جو استاد مکرم کو ہے۔ انکی اس تکلیف پر ہزاروں دل زخمی ہیں ہر آنکھ سے روز کتنی بار دعاؤں کے ساتھ خاموش آنسو گرتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہم سب کو ہے۔ الفاظ میں اس خاموش درد کا اظہار گوجرانوالہ سے ایک بہن نے کیا ہے۔ یہ سیدھی سادہ سی جذبات سے لبریز تحریر۔ ان ہزارہا دلوں کی ترجمان ہے جو ہمہ وقت استاد المکرم کی صحت کیلئے دعاؤں میں مگن ہیں۔ آپ کی دعاؤں میں کتنی شدت اور کتنا خشوع پیدا ہوتا ہے کہ آپکی آہ اور التجا عرش بریں میں گونج اٹھے۔ یہ تو اس بہن کی "التجا" پڑھنے کے بعد، آپ کا دل آپ کو بتا دے گا۔

التجا

ایک طالبہ

حضرت جی کا گوجرانوالہ کا دورہ شروع ہونیوالا تھا۔ ہمیں بھی اطلاع ملی۔ ہزار دعاؤں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور ہمارا پروگرام بھی گوجرانوالہ جانے کا بن گیا۔ حضرت شام کو ڈاکٹر عظمت صاحب کی رہائشگاہ پر پہنچ رہے تھے۔ کشاں کشاں ہم بھی دھڑکتے قلب کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوئے تو ایک لمحہ کے لیے یوں لگا جیسے غلط جگہ آ گئے ہیں۔ سارا لان سائبانوں اور قناتوں سے سجا ہوا تھا اور پچھلی طرف دیگوں میں کڑچھ کی جھنکار نے یہ احساس دلایا کہ یہاں تو شاید کسی شادی کا اہتمام ہو رہا ہے۔ اندر داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ اہتمام تو اسی ہستی کے لیے ہے۔ کیونکہ ساتھیوں کی تعداد کے پیش نظر باہر انتظام کیا گیا ہے۔ مغرب ہوتے کو تھی اور ساتھی مرد اور خواتین کا ایک سیلاب تھا جو چلا آ رہا تھا خواتین کے لیے علیحدہ اہتمام تھا اور ہر ایک دوسرے سے اس طرح مل رہا تھا جیسے عید ہو۔ اور کیوں نہ ہو۔ دل والوں کے لیے حضرت کا دیدار ہزار عیدوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ بہرحال سب کو مل ملا بیٹھے اور گھر والوں سے دریافت کیا کہ حضرت نے تو دوپہر کو پہنچنا تھا پھر ابھی تک پہنچے کیوں نہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت خراب ہے بڑا سخت بخار ہے۔ ان کے بخار کا سنکر جیسے دل سینے میں بیٹھ سا گیا۔ مگر معلوم ہوا کہ بخار تو وقتی ہے اتر جائے گا لیکن وہ تو بڑے سخت بیمار ہو گئے ہیں۔ کیا ہوا؟۔ ہم نے تڑپ کر دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے کچھ دن پہلے اسلام آباد سے

سارے چیک اپ کروائے ہیں۔ جس سے پتہ چلا کہ ان کے خون میں انتہائی درجہ کی شوگر اور ... دریافت ہوئی ہے۔ اس درجے کہ ڈاکٹروں کے مطابق ان کی زندگی خطرے میں ہے ہم منہ کھولے یہ سب کچھ سُن رہے تھے اور دل تھا جیسے سینے میں کہیں پیچھے ہی نیچے ڈوبتا جا رہا تھا۔ بتلانے والا جا چکا تھا۔ اپنے کام میں مصروف بھی ہو چکا تھا۔ لیکن ہم وہیں بیٹھے اپنے ڈوبتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ بڑے حضرت جی کے جانے کے بعد وہ اتنی جلدی کیسے جا سکتے ہیں؟ ابھی تو ان کو اتنے کام کرنے ہیں۔ ابھی تو یہ جماعت دنیا میں پھلنے پھولنے لگی ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔ دل و دماغ نے ایک لمحے میں ہزاروں طفل تسلیاں دے ڈالیں اور ہم نے سب مان لیں۔ دل کو سنبھالا اور انتظار کرنے والوں میں جا بیٹھے۔ کچھ پرانے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ سب لوگ خوش خوش تھے۔ اللہ اور اللہ والوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہم بھی ان میں شامل ہو گئے لیکن اندر کی کیفیت وہی رہی۔ دل پر جو ایک کپکپا دینے والا خوف طاری ہو گیا تھا جان نکالے دے رہا تھا۔ لیکن ڈرتے کسی سے ذکر نہ کیا کہ مبادا کوئی سننے والا ان تسلیوں کی تردید کر بیٹھے جن کے سہارے ہم نے دل کو کچھ سنبھالا ہوا تھا۔ اتنے میں گھر کے اس حصے میں ایک دم ہلچل مچ گئی جہاں حضرت کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ معلوم ہوا حضرت پہنچ گئے ہیں۔ اور دس منٹ بعد وہ باہر درس بھی دیں گے اور ذکر بھی کروائیں گے۔

پردہ والے حصے میں دوسری ساتھی عورتوں کے ساتھ ہم بھی باہر پہنچے اور ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت کا بیان شروع ہوا ان کی آواز سنی ہمیشہ کی طرح مضبوط اور صحت مند لگی۔ سوچا شاید کہنے والے نے کچھ مبالغہ آرائی کی ہو۔ حضرت تو بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں دل کو جیسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ بیان ختم ہوا ذکر شروع ہوا۔ سینکڑوں لوگوں نے اکٹھے بیٹھ کر اس ذاتِ اقدس سے فیض حاصل کیا۔ ذکر ختم ہوا تو عشاء کی نماز کا وقت ہو چکا تھا نماز ادا ہوئی تو کسی نے پیغام دیا کہ عورتیں اندر چلی جائیں حضرت وہاں ہی ان کو علیٰحدہ وقت دیں گے۔ اور جنہوں نے بیعت کرنا ہے کر لیں۔ سب خواتین اندر پہنچیں۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ حضرت سے قریب تر بیٹھ سکیں۔ ہم نے سب سے پیچھے ایک کمرے میں جگہ سنبھالی۔ حضرت اندر تشریف لائے۔ ہمیشہ کی طرح شگفتہ، مسکراتے ہوئے اور دیکھنے میں بالکل صحت مند دل نے کہا کہنے والے نے یقیناً مبالغہ آرائی کی ہے حضرت تو ماشاءاللہ بالکل ٹھیک دکھائی دیتے ہیں۔ یوں لگا جیسے دل کو اس خوفناک کپکپی سے نجات مل گئی۔ کچھ عورتیں بیعت ہوئیں۔ کسی نے کوئی دعا کروائی۔ کسی نے تعویذ لیے اور آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگیں۔ صرف ہم لوگ جو پرانے ساتھی تھے اور جنہوں نے وہاں قیام کرنا تھا رہ گئے۔ حضرت لوگوں کو رخصت کرتے کے بعد اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ کونے میں ہم پر نظر پڑ گئی۔ دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ کمال شفقت سے حال دریافت فرمایا اور پاس ہی بیٹھ گئے۔ باقی سب لوگ بھی

لبلبے کے خلیات کی کام یاب پیوندکاری

ذیابیطس کا مرض انسولین کی کمی سے لاحق ہوتا ہے، جب کہ انسولین کو لبلبہ تیار کرتا ہے۔ اس کے خاص خلیات کی خرابی کی صورت میں بطور علاج انسولین جسم میں بذریعہ انجکشن داخل کرنا پڑتی ہے۔ سائنس داں صحت مند لبلبہ کے یہی خلیات ایسے مریضوں کے لبلبے میں لگا کر انسولین کی مستقل فراہمی کے تجربات کر رہے ہیں۔ پیوندکاری اعضا کے تمام آپریشنوں کی طرح اس عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ جسم کا عمل استرداد ہے۔ یعنی وہ کسی اور کے اعضا بلکہ خلیات کو بھی قبول نہیں کرتا، لیکن سائنس داں اب اس عملِ استرداد پر بڑی حد تک قابو پا چکے ہیں۔ انھیں جانوروں میں لبلبے کے خلیات کے گچھوں کی پیوندکاری کے سلسلے میں کام یابی حاصل ہوئی ہے۔ چناں چہ اب یہ عمل انسانوں پر آزمایا جا رہا ہے۔ اس کا آغاز ذیابیطس کے ایسے ۲۷ مریضوں سے کیا گیا ہے جن کے لیے زندگی بھر روزانہ انسولین کا ٹیکا لگوانا ضروری ہے۔ یعنی جو ذیابیطس کی قسم اول کے مریض ہیں ان کے جسم میں بڑی احتیاط سے تیار کردہ لبلبے کے خلیات کی پیوندکاری خاصی کام یاب بھی ثابت ہو رہی ہے تاہم یہ خلیات عارضی طور پر انسولین تیار کرتے ہیں، لیکن ایک خاتون مریض کے لبلبے میں لگائے گئے یہی خلیات پچھلے کئی ماہ سے

تجربات کام کر رہے ہیں۔

سائنس دانوں کے مطابق آئندہ پانچ سال بعد اس سلسلے میں قطعی نتائج حاصل کر لیں گے۔ یعنی عمل استرداد پر مکمل قابو پانے کے بعد ذیابیطس کا شافی علاج ممکن ہو جائے گا۔

بیٹھے۔ پھر ہم نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا کہ حضرت طبیعت کیسی ہے۔ سُنا ہے خون میں شوگر دریافت ہوئی ہے۔ ایکدم زور سے ہنس کر بولے کہ ڈاکٹروں کے مطابق تو مجھے خدانخواستہ مرا ہونا چاہیئے تھا وہ حیران ہیں کہ میں زندہ ہوں۔ دل جو طفل تسلیوں سے کچھ سنبھلا ہوا تھا یہ الفاظ سن کر ایسا ڈوبا کہ آج تک سنبھل نہ سکا۔ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر حضرت نے ہم لوگوں کو پھر وقت دیا اور دیر تک مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی۔ ڈرتے ڈرتے دوبارہ دریافت کیا کہ حضرت اس کے ٹھیک ہونے کے امکانات کیا ہیں؟ دوبارہ ہنس کر فرمایا کہ بھئی اب بہت ٹھیک ہوگیا ہوں آرام کو جی چاہتا ہے۔ اب آرام کرنے دو۔ تڑپ کر کہا حضرت جی ایسا نہ کہیں۔ ہمارا کیا ہوگا؟ فرمایا ہو سکتا ہے کسی تم جیسے کی دعا کام آجائے۔ اور بیماری ٹل جائے۔ پھر ہم نے کچھ نہیں پوچھا۔ پوچھنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ صحبت میں بیٹھے جیسے ایک خواب کے عالم میں تھے۔ دل اب تک تڑپ تڑپ کر دہائی دے رہا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس پاگل کو کیا معلوم کہ یہ سب تو ہو چکا۔ اس پر کسی کا بس نہیں۔ ہاں انہوں نے خود فرمایا۔ ایک راستہ کھلا ہے دعا کا۔ دل نے بات سمجھائی اور ہم اس گھڑی سے لیکر اس وقت تک اسی دعا میں مگن ہیں۔

یہاں میرا خیال ہے میں اپنا تھوڑا سا تعارف کروا دوں۔ میں وہ بیٹی ہوں جو اس سلسلہ سے کچھ عرصہ سے منسلک ہوں۔ اور اس عرصہ میں حضرت جی کی شفقت توجہ کے اتنے خزانے لوٹے کہ وہ ہیروئن کے نشے کی طرح خون کو لگ گئے۔ مجھے بڑا زعم ہوا کرتا تھا کہ میں دنیا کی بڑی خوش قسمت لڑکی ہوں کہ اپنے ماں باپ بھائیوں اور شوہر سے جتنی محبت میں نے پائی ہے۔ شاید ہی کسی لڑکی کو ملی ہو۔ لیکن حضرت جی کی شفقت کے آگے ان شفقتوں کی حیثیت ایسے ہی ہے جیسے سورج کے سامنے ذرہ۔ یہ وہ ہستی ہے جس کی مثال اس مضبوط چٹان کی سی ہے جو اپنے اوپر سخت دھوپ، آندھیاں، سخت بارش سبھی کچھ برداشت کرتی ہے لیکن اپنے سائے میں بیٹھنے والوں کو احساس بھی نہیں ہونے دیتی کہ اس سایے کی وجہ سے وہ کتنے محفوظ ہیں (مجھے بھی اس حفاظت کا احساس اس وقت ہوا جب اس کے چھن جانے کا اندیشہ ہوا) یہ وہ ہستی ہے جس نے جماعت کے سب سے پرانے ساتھی سے لیکر نئے شامل ہونیوالوں میں سے ہر ایک کو یہ زعم دیا کہ حضرت جی کا اس سے خاص تعلق ہے کہ وہ سب سے زیادہ پیار اس ہی سے کرتے ہیں اور اگر کبھی اجتماع کے دنوں میں سب نے انہیں اکٹھا دیکھا تو سمجھائی کہ ان کا تعلق تو جماعت کے ہر ساتھی سے ایسا ہی ہے۔ ہم لڑکیوں نے اجتماع کے بعد جاتے ہوئے اجازت مانگی۔ ہماری آنکھیں اشکبار تھیں۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی اشک نظر آئے۔ یہ کیسی ہستی ہے یہ کیسا تعلق ہے۔ جس کے سامنے ہر بنیادی رشتہ ہیچ نظر آتا ہے۔

آج ہماری وجہ سے وہ اتنا تھک گئے ہیں کہ لمبے آرام کی خواہش ہے۔ رات کو سوتے نہیں تو گناہگاروں کے غم میں گھلتے اور ان کی بقا رکی دعا کرتے ہیں۔ دن کو آرام اس لیے نہیں کرتے کہ جہنم کیطرف سرپٹ دوڑنے والوں کو بازو سے کھینچ کھینچ کر نجات کی راہ پہ گامزن کر رہے ہیں۔ سفر کے دوران، دوروں کے دوران آرام اس لیے نہیں کرتے کہ وہ لوگ جو خدا کی رسی پکڑنے کے لیے کوشاں ہیں وہ ان کو ناامید نہیں کر سکتے۔ یہ کیسی شخصیت ہے؟ یہ کیسی ہستی ہے؟ جس نے آج تک ہمیں علم و شفقت کے ساتھ ساتھ دعاؤں کے خزانوں سے مالا مال کیے رکھا۔ آج کیا وقت آیا کہ ہم میں سے شاید کسی کی دعا کام آجائے۔ یہ اس لیے نہیں کہ انہیں ہماری دعاؤں کی ضرورت ہے۔ یہ اس لیے کہ ہمیں ان کی ضرورت ہے بہت ضرورت ہے۔

آج میرا اتنا کچھ لکھنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ آیئے آپ بھی میری طرح ان کی صحت کی دعا کیجیے۔ اسطرح نہیں جسطرح ہمیشہ دعا کرتے ہیں۔ بلکہ اس طرح دعا کریں کہ عرش بریں کے اوپر کی دنیا کو پتہ چلے کہ یہ اللہ کا نام لینے والے کسی مقصد کے لیے دعا گو ہیں۔ اس میں اتنا خلوص، اتنی تڑپ، اتنی لگن ہو جتنی کہ اس ہستی کے دل میں ہمیں سدھارنے کے لیے ہے۔ جو جو کسی کا مقام ہے وہاں بیٹھ کر ہاتھ اٹھا کر، گڑگڑا کر، رو رو کر جھولی پھیلا کر، سجدے میں گر کر جس طرح بھی ہو سکے دعا کیجیے۔ راتوں کے پچھلے پہر جاگنے کو بڑی فضیلت حاصل ہے۔ جو جاگتے ہیں وہ خاص طور پر اور جو نہیں جاگتے وہ اہتمام سے جاگ کر اس کی بارگاہ میں التجا کریں۔ کسے معلوم کہ کونسا وقت مٹی سے سونا بننے کا ہو۔ اور کیا معلوم کس وقت کس کی سُنی جائے کوشش تو بس یہ ہونی چاہیئے کہ کہ سنی جائے۔ اور وہ! وہ تو غفور ہے رحیم ہے۔ پھر اس کا تو فرمان ہے کہ وہ اپنے بندوں کو اس سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ جتنا کہ ایک ماں اپنے بچے سے پیار کرتی ہے تو اگر ہم

باقی صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ فرمائیں

اعجازِ قرآنی

قرآن مجید

ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ
اسسٹنٹ پروفیسر صدر شعبہ ترجمہ
اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ

کے حیران کن سائنسی انکشافات

یوں تو قرآن مجید ہر دور میں ایک معجزہ ہے لیکن سائنس کے جدید دور میں قرآنی اعجاز نئے ہی اسلوب میں نکھر کر سامنے آگیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں سائنسی علم اور حکمت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے قرآن مجید کے فہم کے افق اور واضح اور نمایاں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ سائنس اور فلسفے کا طالب علم جب اس دور میں قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہے تو آیات قرآنیہ اس سے عجیب و غریب انداز میں گویا ہوتی ہیں کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

بہت سی باتیں ہیں جو کہ ڈیڑھ ہزار سال قبل بیان کر دی گئی ہیں۔ لیکن اس لئے سمجھ میں نہ آسکیں کہ انسان کا فہم اور اس کی تحقیق تفتیش کا درجہ اس فہم و بصیرت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بہت سی باتیں جو کہ آج ہمارے لئے محض جدید انکشافات ہیں اور گذشتہ ایک ڈیڑھ صدی سے پہلے انسان کو ان کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ قرآن مجید میں انتہائی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔ کیا یہ اس بات کا کھلا ثبوت نہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور ایسا کھلا ہوا معجزہ جو اپنی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے وجود کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اور نہ ختم ہونے والی شہادت۔

ذیل میں ہم چند ایسے ہی امور کی طرف اشارہ کریں گے جو قرآنی اعجاز سے متعلق ہیں اور سائنس اور فلسفۂ حکمت کے ہر طالب علم کو بزبانِ حال یہ دعوت دے رہی ہیں کہ:

دست ہر نااہل بیمارت کند
سوئے مادر آکہ تیمارت کند

مطالعۂ فطرت

دنیا میں قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے انسان کو مطالعۂ کائنات، علم، حکمت اور قراءت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ آج سے چودہ سو سال قبل صحرائے عرب میں نہ کوئی کتاب تھی نہ مصنف نہ صاحب علم، اور نہ پڑھنے لکھنے کا رواج تھا۔ بعض حضرات کے بقول اس وقت سارے عرب میں ایسے افراد کی تعداد تقریباً دو درجن تھی جو اپنا نام یا خط لکھ سکتے تھے، مگر حیرت ہوتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوتی ہے تو اس طرح سے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ - اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ - (علق: ۱-۵)

"پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یا پھر ایک جگہ قلم کی قسم کھائی جاتی ہے۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ - مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ - (القلم: ۱-۲)

"قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو لکھی جاتی ہے جو یہ لوگ لکھتے ہیں (یعنی قلم اور لکھی ہوئی چیزوں کی اور لکھی ہوئی کتابیں اس بات کی شاہد ہیں) کہ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دیوانے

نہیں ہیں"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ - اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران: ۱۹۰-۱۹۱)

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اور آسمان اور زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے"۔

یُؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ - (البقرہ: ۲۶۹)

"اور جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں"۔

فطرت اور کائنات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے کسی جگہ متقی اور صاحب ایمان و یقین اور کہیں عالم اور کہیں اصحاب تدبر و حکمت قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کے تقریباً ہر صفحے پر اس قسم کی آیات ملتی ہیں۔

اٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ "یہ ارباب عقل کے لئے نشانیاں ہیں"۔

اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ "یہ اصحاب یقین کے لئے نشانیاں ہیں"۔

لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ۔ "یہ اہل علم کے لئے نشانیاں ہیں"۔

لَاٰیٰتٍ یَّوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ "یہ اہل ایمان کے لئے نشانیاں ہیں"۔

لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ "یہ سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں"۔

لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَذَكَّرُوْنَ "اس میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں"۔

قابل غور بات یہ ہے کہ کیا حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی نبی، فلسفی یا حکیم نے مطالعۂ کائنات کی طرف اس قدر زور دار انداز سے توجہ دلائی تھی؟ کیا کوئی شخص کسی ایسی بات کی دعوت دے سکتا ہے جس کی اہمیت کا انکشاف بارہ تیرہ سو سال بعد ہونا ہو۔ صاف پتہ چل رہا ہے کہ ان آیات میں اور اس دعوت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ دانش فراست اور بصیرت کارفرما تھی۔

عالمی شہرت یافتہ مصنف "موریس بکائیے" اپنی کتاب "بائیبل قرآن سائنس" میں لکھتے ہیں:۔

"جب میں نے پہلے پہل قرآنی وحی و تنزیل کا جائزہ لیا تو میرا نقطۂ نظر کلیتہً معروضی تھا۔ پہلے سے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہ تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ قرآنی متن اور جدید سائنس کی معلومات کے مابین کس درجے مطابقت ہے۔ تراجم سے مجھے پتہ چلا کہ قرآن ہر طرح کے قدرتی حوادث کا اکثر اشارہ کرتا ہے۔ لیکن اس مطالعے سے مجھے مختصر سی معلومات حاصل ہوئیں۔ جب میں نے گہری نظر سے عربی زبان میں اس متن کا مطالعہ کیا اور ایک فہرست تیار کی تو مجھے اس کام کو مکمل کرنے کے بعد اس شہادت کا اقرار کرنا پڑا جو میرے سامنے تھی۔ قرآن میں ایک بیان بھی ایسا نہیں ملا جس میں جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے حرف گیری کی جا سکے۔

اسی معیار کو میں نے عہد نامۂ قدیم اور اناجیل کے لئے آزمایا اور ہمیشہ وہی معروضی نقطۂ نظر قائم رکھا۔ اول الذکر میں مجھے پہلی ہی کتاب آفرینش سے آگے نہیں جانا پڑا اور ایسے بیانات مل گئے جو جدید سائنس کے مسلمہ حقائق سے کلی طور پر عدم مطابقت رکھتے تھے" (۱۰: ۱۴)

یہی صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اناجیل کا مکمل طور پر مطالعہ کیا جائے تو عیسائیوں کو بدرجۂ غایت انتشار میں مبتلا کر دے"۔

(۱۰: ۶۶)

کائنات دھواں ہی دھواں تھی:۔

آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کائنات ابتداء میں دھواں ہی دھواں تھی اور اس میں سے اجرام فلکی پیدا کئے گئے۔ ہاں جدید سائنس یہ کہتی ہے کہ کائنات کی تشکیل ایسے گیسی مادے سے ہوئی تھی جو ہائیڈروجن اور ہیلیم کی اس مقدار سے مرکب تھا اور آہستہ آہستہ گردش کر رہا تھا۔ یہ انجام کار متعدد ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

اس دور کے سائنسدانوں نے اس دھوئیں کو اب بھی دیکھا ہے اور مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کس طرح اس سے آج تک ستارے بن رہے ہیں۔ دیکھیئے ڈیڑھ ہزار سال قبل اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو کیا علم عطا فرمایا۔ ارشاد باری ہے۔

"ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَآئِعِينَ"

(حٰمٓ السجدہ : ۱۱)

"پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا اس نے آسمان اور زمین سے کہا" وجود میں آجاؤ، خواہ تم چاہو نہ چاہو"۔ دونوں نے کہا "ہم آگئے فرماں برداروں کی طرح"۔

موریس بکائیے لکھتا ہے :۔

کائنات کے ابتدائی مرحلہ میں "دخان" (دھواں) کی موجودگی جس کا حوالہ قرآن مجید میں موجود ہے اور جس سے مراد مادہ کے زیادہ تر گیسی حالت ہے صریحاً اس ابتدائی سدیم کے تصور سے مطابقت رکھتا ہے جو جدید سائنس نے پیش کیا ہے"۔ (۱۰ : ۱۸۳)

زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی

دورِ جدید کے سائنسدان اس بات پہ متفق ہیں کہ زندگی کی ابتداء پانی سے ہوئی۔ اور پانی تمام جاندار خلیات کا جزو اعظم ہے۔ اور پانی کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہے، جب کسی دوسرے سیارے پر زندگی کے امکان پہ بحث کی جاتی ہے تو پہلا سوال ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ کیا وہاں حیات کو قائم رکھنے کے لئے کافی مقدار میں پانی موجود ہے؟ جرمنی کا ایک حیاتیالوجسٹ ابراہم ورنر (۱۷۵۰ء۔ ۱۸۱۷ء) تمام تبدیلیوں کو ایک ہی سبب یعنی پانی کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "پہاڑوں کی تعمیر پانی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ پانی میں سے وہ گیسیں بنی جو بطنِ زمین کے مواد کو باہر لائی تھی اور دلکان کی آتش فشانی میں بھی پانی کا دخل تھا"۔

(۵ : ۸۶)

جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا کسی شخص کے علم میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ زندگی کی ابتداء پانی سے ہوئی۔ لیکن قرآن مجید میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیاء : ۳۰)

"اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز کو پیدا کیا"۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّن مَّآءٍ (النور : ۴۵)

"اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا فرمایا"۔

موریس بکائیے لکھتے ہیں۔

قرآن میں شامل حیات کی ابتداء کے تمام بیانات جدید سائنسی معلومات سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔ زندگی کی ابتداء سے متعلق جو اساطیر نزولِ قرآن کے وقت عام طور پہ رائج تھے ان میں سے کوئی بھی قرآن کے متن میں مذکور نہیں ہے

(۱۰ : ۲۳۵)

دنیا کی تمام اشیاء جوڑا جوڑا پیدا کی گئیں

اس دور میں سائنس دانوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ تمام کی تمام نباتات میں بھی ہر چیز جوڑا جوڑا ہے۔ ان میں ایک نر ہے اور ایک مادہ۔

مگر یہ بات اس زمانے میں جبکہ قرآن مجید نازل ہو رہا تھا کسی شخص کو بھی معلوم نہ تھی۔ لیکن قرآن مجید میں بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَأَنۢبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ (لقمان : ۱۰)

"پس ہم نے زمین میں پودوں اور نباتات کے اچھے جوڑے لگائے"۔

وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (الرعد : ۳)

ہر چیز یعنی حجر، شجر، چرند، پرند ذکر کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ادراک باتیں نہیں کر سکتے۔ جب تک دنیا میں ایک انے بھی اللہ کا نام لینے والا باقی ہے قیامت کے نہیں آئے گی اور جب دنیا میں اللہ کا خوشبو نام لینے والا ایک بھی فرد باقی نہیں رہے خوشبو گا تو قیامت آجائے گی۔ اس سے ثابت ہوا کہ بقائے عالم کا انحصار بھی ذاکرین پر ہے

(حضرت مولانا اللہ یار خان رحمہ

"اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔"

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ
وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ (یٰسٓ: ۳۶)

"پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کئے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (نوع انسانی میں سے) یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔"

نباتات میں سبز مادے کی اہمیت

دورِ جدید میں سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ جب پانی نباتات پہ ڈالا جاتا ہے تو نباتات میں ایک سبز رنگ کا مادہ پیدا ہوتا ہے جسے انگریزی میں کلوروفل CHLOROPHYLL کہتے ہیں۔ یہی وہ مادہ ہے جس کے ذریعے سے نباتات میں دانے اور پھل پیدا ہوتے رہیں۔ یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھی لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَهُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیۡءٍ فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا (الانعام: ۹۹)

"وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ اور اس کے ذریعے نباتات میں سے ہر چیز پیدا کی اور اس میں سبز مادہ پیدا کیا۔ جس کے ذریعے سے ہم دانوں کے ڈھیر پیدا کر لیتے ہیں۔"

حمل اور ہوائیں

ابھی ہم نے بیان کیا کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ جدید سائنسی تحقیق یہ ہے کہ نر میں زرد رنگ کے ذرات ہوتے ہیں جو پولن POLLEN کہلاتے ہیں۔ اگر یہ ذرات مادہ تک نہ پہنچیں تو بیج اور پھل نہیں لگتے۔ قدرت ان ذرات کو مادہ پھل تک پہنچانے کے لئے کئی طریقے استعمال کرتی ہے بعض پودوں میں دونوں قسم کے پھول ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ جب ہوا یا بھونروں کے بیٹھنے سے شاخیں ہلتی ہیں تو پھول مادہ پھول پہ گر پڑتا ہے، اگر مادہ اور نر پھول کے پودے الگ الگ ہوں تو عموماً ہواؤں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہوائیں پولن کو اڑا کر مادہ پھولوں پر ڈال دیتی ہیں۔ بھونرے بھی یہی کام کرتے ہیں کہ جب وہ پھولوں کا رس چوسنے کے لئے نر پھول میں گھستے ہیں تو پولن کی کچھ مقدار ان کے پروں اور ٹانگوں سے چمٹ جاتی ہے اور جب وہ مادہ پھول میں داخل ہوتے ہیں تو کچھ پولن وہیں چھوڑ آتے ہیں۔ دریاؤں میں لگنے والے پودوں کا پولن پانی میں سفر کرتا ہے پرندے، گلہری، چوہے اور کیڑے مکوڑے بھی یہی فرض انجام دیتے ہیں۔ چونکہ پولن کی تقسیم کا سب سے بڑا ذریعہ ہوائیں ہیں اس لئے قرآن مقدس نے انہی کے ذکر پر اکتفا کی ہے عربی زبان میں لقح کے معنی ہیں حمل کرنا "لقحت المرأۃ" یعنی عورت حاملہ ہوگئی۔

لواقح (یعنی حاملہ اونٹنیاں) ریح لاقح، حمل کر دینے والی ہوا۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَاَرۡسَلۡنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ (الحجر: ۲۲)

"ہم نے حاملہ کر دینے والی ہوائیں چلائیں۔"

قرآن مجید میں ایسی حقیقت کا ذکر آجانا جس کا انکشاف آج سے دو سو سال پہلے ہوا اس امر کا اعلان ہے کہ:

تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۚ كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰیٰتُهٗ قُرۡاٰنًا
عَرَبِیًّا لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ (حٰمٓ السجدہ: ۲-۳)

"رحمٰن اور رحیم رب نے ایک با علم قوم کے لئے ایک ایسی کتاب نازل کی جس کی آیات مفصل ہیں اور وہ عربی زبان میں ہیں۔ (حوالہ ۶: ۴۵)

دودھ کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں قرآن مجید کا انکشاف

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَاِنَّ لَكُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً ؕ نُسۡقِیۡكُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِهٖ
مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ (النحل: ۶۶)

یقیناً جانوروں میں تمہارے لئے ایک سبق ہے۔ ہم تمہیں ان کے جسموں کے اندر کی اس چیز سے جو آنتوں کے مادہ اور خون کے اختلاط سے ہے، ایسا دودھ دیتے ہیں جو پینے والوں کے لئے خالص اور فرحت بخش ہوتا ہے۔"

مورس بکائیے" اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"دودھ کے اجزائے ترکیبی پستان کے غدودوں سے رستے ہیں، پھر یوں ہوتا ہے کہ ان کو غذا کے ہضم ہونے والی اس شے سے غذائیت ملتی ہے جو خون کی نالیوں کے ذریعے ان اجزا

تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ خون اس شے کا جو کھانے سے حاصل ہوتی ہے جمع کرنے اور پہنچانے والا عامل ہے اور اسی سے پستانوں کے غدودوں کا تغذیہ ہوتا ہے۔ جہاں دودھ کی تولید ہوتی ہے اور اسی طرح کا عمل ہے جس طرح کا دوسرے کسی عضو کے ساتھ ہوتا ہے۔

یہاں وہ ابتدائی عمل جو ہر دوسری چیز کو حرکت میں لے آتا ہے آنت اور خون کے مشمولات کو خود جدار الامعاء کی سطح پر باہم ملا دیتا ہے۔ یہ نہایت واضح تصور کیمیا اور علم اعضاء میں تحقیقات کے نتیجے کے طور پر حاصل ہوا ہے، رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے اس کا قطعاً علم نہیں تھا اور محض ماضی قریب میں اس کو سمجھا گیا ہے۔ دوران خون کی دریافت نزولِ قرآن کے تقریباً دس صدیوں بعد" ہاروے نے کی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان تصورات کے حوالوں کی قرآن میں موجودگی کی وضاحت انسان کے بس کی بات نہیں اس لئے کہ وہ تصورات بعد میں وضع ہوئے"۔ (۲۴۹ : ۱۰)

بلندی پر سانس کی تنگی

جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا، لوگوں کا خیال تھا کہ جو شخص بلندی کی طرف جائے گا۔ اسے زیادہ تازہ ہوا ملے گی اور اسے زیادہ فرحت اور زیادہ خوشی حاصل ہوگی۔ لیکن جدید دور میں جب انسان نے ہوائی جہاز ایجاد کیا اور وہ تیس چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرنے لگا۔ اسے پتہ چلا کہ بلندی پر جاتے ہوئے اسے نسبتاً کم آکسیجن مہیا ہوتی ہے اور سانس لینے میں بہت دشواری لاحق ہوتی ہے۔ اس شدید گھٹن سے بچنے کے لئے ہوائی جہازوں میں مصنوعی طور پر آکسیجن پہنچانے کا انتظام رکھا جاتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ اس قدر بلندی پر جانے کا تصور تھا اور نہ ہی آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا۔ لیکن قرآن مجید میں یہ آیت ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے:۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ۔ (الانعام : ۱۲۵)

"پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ رکھتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے (بلندی کو جا رہا ہے)"۔

درد کا احساس جسم میں صرف جلد کو ہوتا ہے

جدید طب نے یہ دریافت کیا ہے کہ وہ اعصاب جو درد کا ادراک کرتے ہیں خواہ وہ درد چوٹ لگنے سے، جلنے سے یا شدید گرمی و سردی کی وجہ سے ہو وہ اعصاب فقط جلد میں ہی پائے جاتے ہیں یعنی اگر جسم میں سوئی چبھوئی جائے تو درد صرف جلد کی سطح پر ہوگا لیکن اگر سوئی جلد سے آگے گذار دی جائے تو بقیہ گوشت میں فی الواقع درد نہیں ہوگا یہ بات تو جدید دور کی تحقیق ہے، لیکن اس کی طرف اشارہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔

(النسآء : ۵۶)

"جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے"۔

یعنی درد اور تکلیف کا تعلق قرآن مجید میں صرف جلد سے بیان کیا گیا ہے اور مزید تکلیف پہنچانے کے لئے بار بار جلد ہی کو تبدیل کیا جائے گا۔

پہاڑ زمین کی میخیں ہیں

دورِ جدید میں یہ بات سائنس نے دریافت کی کہ زمین کے بیرونی حصہ (قشر ارضی) کے اس سخت حصے کے نیچے ایک نرم طبقے کے اندر داخل ہو کر زمین کی جڑوں کا کام کرتے ہیں اور زمین کو ہلنے اور کھسکنے سے بچاتے ہیں اور یوں زمین ایک خاص قسم کے توازن پر قائم رہتی ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں ڈیڑھ ہزار سال قبل بیان کر دی گئی۔

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ (الانبیاء: ۳۱)

"ہم نے زمین پہ پہاڑ بنا دیئے تاکہ زمین انہی سمیت کہیں ڈھلک نہ جائے"۔

وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا (النبأ: ۷)

"ہم نے پہاڑوں کو میخیں بنا دیا" (اور انہیں زمین میں گاڑ دیا)

سمندر میں تہ بہ تہ موجوں اور تہ بہ تہ اندھیروں کا قرآنی تصور:

آج سے ہزار ڈیڑھ ہزار سال قبل انسان کو یہ علم نہ تھا کہ سمندر میں کچھ موجیں سطحی ہوتی ہیں اور کچھ موجیں اس کے نیچے ہوتی ہیں۔ تہ بہ تہ موجوں کا یہ تصور بہت بعد کی دریافت ہے۔ اسی طرح سے لوگوں کے علم میں یہ بات بھی نہیں تھی کہ سمندر کی گہرائیوں میں اندھیرے ہیں اور یہ اندھیرے بھی اسی طرح تہ بہ تہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلیوں کو جگنو کی طرح روشنی عطا کر کے

ان اندھیروں میں روشنی کا انتظام کیا ہے۔

اسی طرح سے لوگوں کے تصور میں یہ بات بھی نہیں آسکتی تھی کہ ایک موج اوپر سے آنے والی روشنی کی کرن کو بالکل ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی روشنی کو زائل کر دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سورج کی روشنی سمندر کی گہرائی تک پہنچتے پہنچتے بالکل ختم ہو جاتی ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ بادل سورج کی بعض شعاعوں کو زمین تک آنے سے بالکل روک دیتے ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب اسرار اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آیت میں بیان کر دیئے ہیں اور آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے:

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ۔

(النور: ۴۰)

"یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اس پر ایک اور موج، اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔ آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔ جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لئے پھر کوئی نور نہیں"۔

قرآن مجید میں سورج اور چاند کا تصور

یہ بات جدید سائنسی دور میں معلوم ہو سکی ہے کہ چاند میں جو روشنی ہے وہ روشنی کا عکس ہے۔ اس کا اشارہ قرآن مجید میں ملتا ہے وہ اس طرح کہ چاند کی روشنی سے انکار تو نہیں کیا گیا، اس کو روشن تو کہا گیا ہے لیکن روشنی کا منبع یا چراغ قرار نہیں دیا گیا۔ صرف سورج کے لئے چراغ بلکہ گرم روشن چراغ (سراجاً وھاجاً) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ جہاں یہ سراج کا لفظ استعمال ہوا ہے اور صیغہ واحد میں استعمال ہوا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید کے نزدیک چاند روشن تو ہے لیکن روشنی کا منبع نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل آیتیں قابل غور ہیں۔

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا۔ (الفرقان: ۶۱)

"خدا بڑی برکت والا ہے جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں آفتاب کا نہایت روشن چراغ اور چمکتا ہوا چاند بھی بنایا"۔

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا۔

(النبأ: ۱۲-۱۳)

"اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کئے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا"۔

یہاں چاند کو ایک ایسا جرم قرار دیا گیا ہے جس سے روشنی منعکس ہوتی ہے (قمراً منیراً)۔ آیت و الفاظ کے اسلوب سے صاف پتہ چلتا ہے کہ چاند کو روشن تو قرار دیا گیا ہے مگر روشنی کا منبع و مصدر قرار نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس سورج کو ایک شعلہ فگن سراج سے یا ایک گرم چراغ (وہاج) سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

بقول موریس بکائیے "قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو ان معلومات کی تردید کرتی ہو جو ہمیں آج ان اجرام سماوی کے بارے میں حاصل ہے (۱۰: ۹۲) یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف سراجاً کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی صیغہ واحد میں۔ اگر چاند کی بھی وہی پوزیشن ہوتی جو سورج کی ہے اور وہ بھی

شعلہ فگن چراغ ہونا تو سراجاً کی بجائے "سراجین" (دو چراغ) کے الفاظ استعمال کئے جاتے۔

سورج اور چاند کے مداروں کا وجود

آج سے ہزار ڈیڑھ ہزار سال قبل دنیا میں اجرام فلکی کے مداروں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس لئے قرآن مجید کے مفسرین کو لفظ فلک کی تشریح کرنے میں بہت دقت پیش آئی۔ موریس بکائیے اس موضوع پر لکھتے ہیں۔

قرآن کے قدیم مترجمین کو اس لفظ (فلک) نے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ جو چاند اور سورج کے مدور راستوں کا تصور قائم نہیں کر سکے تھے، اس لئے انہوں نے خلا میں ان کے راستے میں کچھ ایسی شکلیں محفوظ کر لیں تھیں جو یا تو کسی حد تک درست تھیں یا بالکل ہی غلط تھیں۔

حمزہ ابوبکر اپنے ترجمہ قرآن مجید میں اس لفظ کی وہ مختلف النوع تشریحات پیش کرتے ہیں جو دوسروں نے کی ہیں۔

"ایک قسم کا "دھرا" جو ایک آہنی سلاخ کے مثل ہوتا ہے جس کے گرد کوئی کل گھومتی ہے ایک سماوی کرہ، مدار، برج کی علامتیں، رفتار، لہر۔۔۔"

لیکن پھر وہ حسب ذیل بیان جو دسویں صدی کے مشہور مفسر طبری نے دیا ہے پیش کرتے ہیں۔

"جب ہمیں کسی بات کا علم نہ ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم خاموشی اختیار کریں۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ سورج اور چاند کے مدار کا یہ تصور حاصل کرنے میں کس قدر ناکام رہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر یہ لفظ اس فلکیاتی تصور کو واضح کرتا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عام تھا تو ان آیات کی توضیح و تشریح کرنا انتہائی مشکل ہوتا، لہٰذا قرآن میں ایک بالکل ہی جدید تصور موجود تھا جس کی وضاحت صدیوں بعد تک نہیں کی جا سکی تھی۔"

(۱۰ : ۱۹۷)

اب آیئے دیکھیں کہ قرآن مجید نے فلک یا مدار کا کیا تصور پیش کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝ (الانبیاء: ۳۳)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا یہ سب اپنے اپنے مداروں پر چل رہے ہیں۔"

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔ (یٰسین-۳۹-۴۰)

"اور چاند، اس کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ اس سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار پر تیر رہا ہے۔"

موریس بکائیے اس آیت کی شرح میں لکھتے ہیں۔

اس جگہ ایک اہم حقیقت کا واضح طور پر اظہار کیا گیا ہے وہ ہے سورج اور چاند کے مداروں کا وجود۔ اس پر مستزاد وہ حوالہ ہے جو ان اجرام کی اپنی حرکت سے خلاء میں سفر کرنے کے سلسلے میں دیا گیا ہے۔

ان آیات کے مطالعہ سے ایک منفی حقیقت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ سورج ایک مدار پر حرکت کر رہا ہے لیکن اس بات کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے کہ زمین کے لحاظ سے یہ مدار کون سا ہو سکتا ہے۔ نزول قرآن کے وقت خیال کیا جاتا تھا کہ سورج متحرک ہے اور زمین ساکن۔ یہ زمین کی مرکزیت کا نظام تھا جو بطلیموس کے زمانہ سے مقبول چلا آ رہا تھا۔ جو دوسری صدی عیسوی کا سائنسدان ہے اس کا سلسلہ نکولاس کوپرنکس (۱۵۴۳ء) تک چلا جس کا دور سولہویں صدی عیسوی ہے۔ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ اس نظریہ کے حامی تھے لیکن قرآن کریم میں کہیں بھی اس کا اظہار نہیں ہوا نہ یہاں نہ کہیں اور۔"

(۱۰ : ۱۹۶)

سورج اپنی منزل کی جانب رواں ہے

قرآن مجید میں ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ۔ (یٰسین: ۳۸)

"اور سورج اپنے ٹھکانے کی سمت دوڑا چلا جا رہا ہے۔ یہ

سب زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا نصاب ہے"۔

پندرھویں صدی عیسوی میں پولینڈ کے ایک منجم نکولس کوپرنکس (NICHOLAS COPERNICUS) نے یہ اعلان کیا کہ سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد چکر لگاتی ہے۔ اس سے دنیائے علم میں ایک بھونچال آگیا۔

جب دنیا نے کوپرنکس کے اس نظریہ کو ایک حقیقت سمجھ لیا تو عالم اسلام میں ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی اس لئے کہ قرآن مجید سورج کو متحرک قرار دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اٹھارویں صدی عیسوی میں سر فریڈرک ولیم ہرشل HERSCHEL نے یہ اعلان کیا کہ سورج متحرک ہے۔ اس کا قول ہے:

"The sun is travelling through space".

"سورج خلا میں سفر کر رہا ہے"۔

(الیف ملیس، گریٹ ڈیزائن S-A - لندن ۱۹۳۴ء، ص ۲۴۔ دیکھئے حوالہ ۲ : ۲۴)

سورج کس طرف سفر کر رہا ہے۔ کیلیفورنیا کی ایک رصدگاہ کے ڈائریکٹر آر۔ جی ایٹکن Aitken کا اندازہ یہ ہے کہ سورج اپنے نظام شمسی سمیت اپنی کہکشاں کے ساتھ چوبیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہا ہے (۶ : ۲۴)۔ جدید ترین انکشاف جو سائنس نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ سورج مجمع النجوم شلیاق کی جانب کسی نامعلوم مرکز کی طرف نہایت تیزی سے بھاگا جا رہا ہے۔ اس مرکز کو سولر ایپکس کہا گیا ہے۔

ایک منجم کہتا ہے کہ سورج میں بھی دو قسم کی حرکت پائی جاتی ہے ایک کہکشاں کے ہمراہ خلاء میں اور دوسری مرکز کہکشاں کے گرد۔

یہاں ایک اہم بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ کوپرنکس کے نظریہ سے متاثر ہو کر قرآن مجید پہ طعن و تشنیع کرتے رہے یا اس صداقت کے بارے میں متبلا ہو گئے۔ انہیں یہ دیکھنا چاہئے کہ سائنس کا ہر نیا انکشاف اور ہر نظریہ اس قابل نہیں ہوتا کہ جہاں وہ دین حق کی کسی بات سے ٹکرایا تو فوراً دین حق کو چھوڑ دیا جائے اور اسے قبول کر لیا جائے۔ نظریات، نظریات ہی ہوسکتے ہیں اور یہ روزانہ بدلتے رہتے ہیں اور ان کی بنیاد پر دین کے حقائق کو متزلزل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی حال آج کل ان لوگوں کا ہے جو ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلام کے بارے میں یا معذرتیں پیش کرتے ہیں یا دین کی بعض باتوں کی تاویل کرتے ہیں۔ ان حضرات کو نظریے میں اور حقیقت میں فرق محسوس کرنا چاہیئے۔ نظریہ روزانہ بدلتا ہے اور حقیقت وہ چیز ہوتی ہے جس کے غلط ہونے کا امکان باقی نہیں رہتا۔

یہ کائنات توسیع پذیر ہے

قرآن مجید کا انکشاف

یہ کائنات ہر دم پھیل رہی ہے اور یہ بات جدید سائنس کی دریافت ہے۔

اس وقت یہ نہایت محکم تصور ہے کہ ایک کہکشاں دوسری کہکشاں سے دور ہٹتی جا رہی ہیں اور اس طرح سے کائنات کی جسامت بڑھتی جا رہی ہے اور جس قدر کہکشائیں ایک دوسرے سے ہٹ جاتی ہیں تو خالی جگہ میں نئی کہکشائیں بن جاتی ہیں۔

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل جبکہ عربوں کے پاس کوئی بھی فلک بینی کا آلہ موجود نہیں تھا قرآن نے ایسی بات کہہ دی جس کا انکشاف ۱۹۴۸ء کے بعد کوہ پیلومر کی ایک بہت بڑی دوربین نے کیا، اور وہ یہ کہ یہ کائنات پھیل رہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (الذاریات : ۴۷)

"ہم نے آسمان کو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور ہم اس میں توسیع کرتے رہیں گے"۔

یہ بات قرآن مجید کے وحی منزل ہونے کا ایک قطعی ثبوت ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے وجود کی ایک کھلی نشانی۔

زمین سکڑ رہی ہے

اس دور کے سائنسدانوں کا نظریہ ہے کہ زمین کے حجم میں آہستہ آہستہ کمی پیدا ہو رہی ہے۔ فلکیات کے مشہور ماہر سر جیمز جینز (۱۸۷۷ء، ۱۹۴۶ء) کا خیال یہ ہے کہ "آغاز میں ایک بہت بڑا ستارہ سورج کے قریب سے گزرا۔ زور کشش سے سورج کا ایک ٹکڑا کٹ کر دور خلا میں گھومنے لگا اور زمین کہلایا۔ شروع میں زمین کا درجہ حرارت وہی تھا جو سورج کا ہے پھر رفتہ رفتہ زمین ٹھنڈی ہونے لگی اور

اب تک ہو رہی ہے۔ جب یہ گرم تھی تو اس کا حجم زیادہ تھا ٹھنڈی ہو جانے کے بعد یہ سکڑنے لگی اور سکڑتی چلی جا رہی ہے (۶-۴۲)

یہ بات آج سے ایک ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے لوگوں کے تصور میں نہیں آ سکتی تھی، لیکن قرآن مجید میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا "

(الرعد: ۴۱)

"کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اطراف (باہر) سے سکیڑتے چلے جا رہے ہیں"

فرعونِ موسیٰ کی لاش کے بارے میں قرآن مجید کی پیش گوئی

قرآن مجید میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ فرعونِ موسیٰ کی لاش کو دنیا بھر کے لئے عبرت کی خاطر محفوظ کر لیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ اٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ۔ (یونس ۱۰-۹۰-۹۲)

"اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے۔ حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا "میں نے مان لیا کہ خداوندِ حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں" (جواب دیا گیا) "اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لئے نشانِ عبرت بنے اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں"

اس موضوع پر ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ سے خط و کتابت کی اور خود بھی تحقیق کی لکھتے ہیں:۔

"عہدِ رسالت میں عرب اقوامِ عالم کی تاریخ تہذیب تمدن ان کے آثار اور علوم و فنون سے مطلقاً ناآشنا تھے۔ انہیں یہ قطعاً معلوم نہ تھا کہ فرعون کتنے تھے اور وہ کب سے مصر پر حکومت کر رہے تھے۔ رہی کھدائیاں تو مصر میں ان کا آغاز پچھلی صدی (انیسویں) کے آواخر میں ہوا تھا اور فرعون موسیٰ کی لاش ۱۹۰۷ء میں ایک انگریز مفتش سر گرافٹن سمتھ کی کوششوں سے برآمد ہوئی (۶: ۱۲۰)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ڈاکٹر صاحب کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:۔

"برٹانیکا کے مضمون "ممی" میں ذکر ہے کہ ۱۹۰۶ء میں ایک انگریز ماہر علم و تشریح سر اگرافٹن ایلیٹ سمتھ نے ممیوں کو کھول کھول کر ان کے حنوط کی تحقیق شروع کی اور چوالیس ممیوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ گولڈنگ لکھتا ہے کہ ۱۹۰۷ء میں سمتھ کو منفطہ کی لاش ملی تھی (یہ منفطہ وہی فرعون ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں غرق ہوا) اس کی پٹیاں کھولی گئیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے جسم پر نمک کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی جو کسی اور ممی کے جسم پر نہیں پائی گئی۔ گولڈنگ یہ بات بیان کرتا ہے کہ فرعون بحیرات مرہ میں غرق ہوا تھا جو اس زمانے میں بحیرۂ احمر سے ملی ہوئی تھیں۔ آگے چل کر لکھتا ہے کہ جزیرہ نما سینا کے مغربی ساحل پر ایک پہاڑی ہے جسے مقامی لوگ جبلِ فرعون کہتے ہیں۔ اس پہاڑی کے نیچے ایک غار میں نہایت گرم پانی کا ایک چشمہ ہے جسے لوگ حمامِ فرعون کہتے ہیں اور سینہ بہ سینہ روایات کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ اسی جگہ فرعون کی لاش ملی تھی۔

میں ان معلومات سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بحیراتِ مرہ میں ڈوبنے کے بعد اس کی لاش پھول کر سطحِ سمندر پر تیرنے اور حمامِ فرعون تک پہنچنے میں کافی وقت لگا ہوگا جس کے دوران میں اس کے گوشت پوست میں سمندری پانی کا نمک جذب ہو گیا ہوگا۔ یہ نمک اس کی لاش کو حنوط کرتے وقت خارج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تین ہزار برس کے دوران میں یہ رفتہ رفتہ اس کے جسم سے خارج ہو کر ایک تہہ کی صورت میں جم گیا تھا اور پٹیاں کھولی گئیں تو یہ نمک

اس پر جما ہوا پایا گیا۔" (۶ : ۱۲۲)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام اسرار جو جدید سائنس کو اس دور میں معلوم ہوئے قرآن مجید میں کس طرح سے بیان ہو گئے؟ وہ کون ہے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آج سے چودہ سو سال پہلے یہ باتیں بیان کر دیں جبکہ نہ دوربینیں اور نہ سائنسی تحقیق و تفتیش کے آلات تھے ہر سمجھ دار انسان یہ بات اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ باتیں قرآن مجید میں انسانی تخیل کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہے۔ وہ فرماتا ہے۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ۔ (الفرقان : ۶)

"اے نبی کہہ دیجئے، اسے اس ہستی نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے۔"

یہ تمام حقائق جو سائنس کو آج معلوم ہوئے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈیڑھ ہزار سال قبل معلوم تھے، اپنی اپنی جگہ پر حجتِ قاطعہ ہیں اور اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کے وجود کی کھلی ہوئی نشانیاں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر روشن دلائل ہیں۔ ایسے دلائل جن کا کوئی ہوشمند انسان انکار نہیں کر سکتا۔

کم سے کم مدتِ حمل

جنین کی پیدائش کی مدت نو ماہ شمار کی جاتی رہی ہے۔ مگر دورِ جدید میں سائنسی تحقیقات نے بیان کیا کہ بچہ ماں کے پیٹ میں چھ ماہ کی مدت گزارنے کے بعد صحیح و سالم پیدا ہو سکتا ہے اور اس کے بعد بقیدِ حیات بھی رہ سکتا ہے۔ گویا جدید سائنسی نقطۂ نگاہ سے جنین کی پیدائش کے لئے کم سے کم مدت نو ماہ کی بجائے چھ ماہ ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہیں یہی بات قرآن مجید نے بالکل صراحت کے ساتھ ڈیڑھ ہزار سال قبل بیان تو نہیں کر دی۔

تفسیر ابن کثیر میں ایک اہم واقعہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ایک صاحب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاں شکایت لے کر آئے کہ اس کی شادی کو صرف چھ ماہ کی مدت ہوئی ہے اور اس کی بیوی کے ہاں لڑکا پیدا ہو گیا ہے۔ بیوی کو اصرار تھا کہ بچہ اس کے خاوند کا ہی ہے، حرامی نہیں ہے لیکن اس کا خاوند اور خود امیر المومنین عورت کی بات کے قائل نہ ہوئے۔ ابھی اس عورت کو سزا سنانے ہی والے تھے کہ سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ پہنچے اور انہوں نے از روئے قرآن فیصلہ دیا کہ بچہ عورت کے خاوند کا ہی ہے اور عورت کو باعزت بری کر دینا چاہیئے۔

۱۔ وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسَانًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ (الاحقاف-۱۵)

"ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی برس میں ہوتا ہے۔"

۲۔ وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ ؕ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (البقرہ ۲ : ۲۳۳)

"مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہے۔"

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ حمل کی مدت اور دودھ پلانے کی مدت کا مجموعہ ڈھائی برس ہے۔ دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کی مکمل مدت دو برس ہے۔

حمل کی مدت خود بخود معلوم ہو گئی یعنی ڈھائی برس سے دو برس تفریق کر دیں۔ یعنی چھ ماہ!

التجا

صفحہ ۸ سے آگے

اس کے حضور اس کے بندے بن کر جائیں تو وہ ضرور ہماری سن لیگا۔ ماں سے تو ضد کر کے بھی انسان چیز مانگ لیتا ہے۔ اس کا فرمان برحق ہے۔ (جس میں شک نہیں) تو وہ ضرور ہماری جھولی بھر دے گا۔ آیئے! ان کی صحت کے لیے، ان کی زندگی کے لیے۔ اس قادرِ مطلق سے اس طرح دعا گو ہوں کہ اگر اسے مقدر بھی بدلنا پڑے تو بدل ڈالے۔

کراماتِ اولیاء

مٹی سے سونا بنانے والوں کا تو سنا ہے، جو اپنی مٹی کو آپ کے سونے سے بدل کر، اپنی کیمیا گری کی داد وصول کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ دلوں کو سونے میں بدلنے والی بات! چلیے آج ان صحرانشین کیمیا گروں کا فارمولا بھی آزما کر دیکھ لیا جائے۔ حرج ہی کیا ہے۔ اگر ویران دل میں بہار آجائے، ڈر کس بات کا۔ ویرانی کوئی ایسا خزانہ تو نہیں جس کی حفاظت کی جائے۔

دل کے ان کیمیا گروں کی پہچان کے لیے قاری عبدالخالق کی تحریر پڑھ کر دیکھ لیجیے۔

کیمیا گر

قاری عبدالخالق

پہلا منظر

تیسری صدی ہجری ختم ہونے کو ہے۔ بغداد کے تخت خلافت پر معتصد باللہ عباسی متمکن ہے۔ خلیفہ معتصم باللہ کے زمانے سے دارالخلافہ کا شاہی اور فوجی مستقر سامرہ میں منتقل ہو گیا ہے۔ پھر بھی سرزمین بغداد میں پندرہ لاکھ انسان بستے ہیں۔ ایران کے اصطخر اور یورپ کے روم کی جگہ اب دنیا کا تمدنی مرکز بغداد ہے۔ بغداد میں آج کل ابن سایاط کی چوری اور عیاری مشہور ہے۔ دس برس سے ابن سایاط مدائن میں قید ہے۔ اس کے خوفناک حملوں سے لوگ محفوظ ہو گئے ہیں۔ تاہم اس کی عیاریوں اور بے باکیوں کے افسانے لوگ بھولے نہیں۔ وہ جب کبھی کسی دلیرانہ ڈاکے کا حال سنتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں یہ دوسرا ابن سایاط ہے۔ ان دس برس کے اندر کتنے ہی نئے ابن سایاط پیدا ہو گئے۔ مگر پرانے ابن سایاط کی شہرت کا کوئی مقابلہ نہ کر سکا۔ بغداد والوں کی بول چال میں وہ جرائم کا شیطان اور برائیوں کا عفریت ہے۔

ابن سایاط کے خاندانی حالات عوام کو بہت کم معلوم ہیں جب وہ پہلی مرتبہ سوق النجار میں چوری کرتا ہوا گرفتار ہوا تو کوتوالی میں اس کے حالات کی تفتیش کی گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ بغدار کا باشندہ نہیں ہے۔ اس کے ماں باپ طوس سے ایک قافلے کے ساتھ آرہے تھے۔ راہ میں بیمار پڑے اور مر گئے۔ قافلے والوں کو رحم آیا اور بغداد پہنچا دیا۔ پہلی گرفتاری کے وقت اس کی عمر پندرہ سولہ برس تھی۔ کوتوال کے چبوترے پر لٹا کر اس کو تازیانے مارے گئے اور چھوڑ دیا گیا۔ اس پہلی سزا نے اس کی طبیعت پر کچھ عجیب طرح کا اثر ڈالا۔ اسوقت تک وہ ایک ڈرا سہما کمسن لڑکا تھا۔ اب اچانک ایک دلیر اور بے باک مجرم کی روح اس کے اندر پیدا ہو گئی۔ یعنی اس کی تمام شقاوتیں اپنے ظہور کے لیے تازیانے کی ضرب کی منتظر تھیں۔ مجرمانہ اعمال کے تمام بھید اور گناہوں کے تمام مخفی طریقے جو کبھی اس کے وہم و گمان میں نہیں گزرے تھے اب اس طرح اس پر کھل گئے جیسے ایک تجربہ کار اور مشاق مجرم کا دماغ اس کے سر میں اتار دیا گیا ہو۔ اب وہ چھوٹی چھوٹی چوریاں نہیں کرتا تھا۔ پہلی مرتبہ جب اس نے چوری کی تھی تو دو دن کی بھوک اسے نان بائی کی دکان پر لے گئی تھی۔ لیکن اب وہ بھوک سے بے بس ہو کر نہیں بلکہ جرم کے ذوق سے وارفتہ ہو کر چوری کرتا تھا۔ اب اس کی نگاہیں نان بائی کی روٹیوں پر نہیں، صرافوں کی تھیلیوں اور سوداگروں کے ذخیروں پر پڑتی تھیں۔ دن ہو یا رات، بازار کی منڈی ہو یا امیر کا دیوان خانہ، ہر وقت اور ہر جگہ اس کی

کارستانیاں جاری رہتیں۔

اس کے اندر ایک فاتح کا جوش تھا۔ سپہ سالار کا سا عزم تھا۔ سپاہی کی سی مردانگی اور مدبر کی سی دانشمندی تھی۔ لیکن دنیا نے اس کے لیے بغداد کے پاژاروں کا چور بننا پسند کیا۔ اس لیے اس کی فطرت کے تمام جوہر جرائم کے میدان میں نمایاں ہوتے لگے۔ فطرت کس فیاضی سے ایک جوہر بخشتی ہے اور انسان کس بیدردی سے انہیں پامال کرتا ہے۔ کچھ دنوں بعد ابن ساباط کی درازدستیاں حد سے بڑھ گئیں۔ حکومت کی خصوصی توجہ ہوئی۔ آخر ایک دن رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا گیا۔ اب یہ کمسن لڑکا نہ تھا۔ شہر کا سب سے بڑا چور تھا۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ فوراً تعمیل ہوئی۔ جلاد نے ایک ہی ضرب سے اس کا پہنچا (کلائی) الگ کر دیا۔ ابن ساباط کے ہاتھ کا کٹنا، کٹنا نہ تھا بلکہ سینکڑوں نئے ہاتھوں کو اس کے شانوں سے جوڑ دینا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ دنیا کے سارے شیطان اور عفریت اس واقعہ کے انتظار میں تھے۔ اب اس نے عراق کے تمام چوروں اور عیاروں کو اکٹھا کیا اور اپنا اچھا خاصا جتھا بنا لیا۔ اور خوب ساز و سامان کے ساتھ لوٹ مار شروع کر دی۔ تھوڑے ہی عرصے کے اندر اس کے دلیرانہ حملوں نے تمام عراق میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ قافلوں پر حملے کرتا۔ محل سراؤں میں نقب لگاتا۔ سرکاری خزانے لوٹ لیتا۔ اور پھر یہ سب کچھ اس عقلمندی سے کرتا کہ اس پر اور اس کے ساتھیوں پر کوئی آنچ نہ آتی۔ ہر موقع پر صاف بچ کر نکل جاتا۔ لوگ جب اس کے مجرمانہ کارنامے سنتے تو دہشت و وحشت سے مبہوت رہ جاتے کہ یہ ڈاکو نہیں جرائم کی ایک خبیث روح ہے۔ جو انسان کو لوٹ تو لیتی ہے مگر اسے چھو نہیں جا سکتا۔ ظاہر ہے یہ حالت کب تک جاری رہ سکتی تھی۔ آخر وہ وقت آ گیا کہ ابن ساباط تیسری مرتبہ قانون کی گرفت میں آ گیا۔ اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو بحفاظت نکال دیا اور خود نکل بھاگنے کی تیاری کرتا ہوا گرفتار ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ ایک رہزن اور ڈاکو کی حیثیت سے گرفتار ہوا تھا جس کی سزا قتل تھی۔ ابن ساباط نے جب دیکھا کہ جلاد کی تلوار سر پر چمک رہی ہے تو اس کے مجرمانہ خصائل نے اچانک ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیا۔ وہ تیار ہو گیا کہ اپنے ساتھیوں کو اپنے بچاؤ کے لیے قربان کر دے۔ اس نے عدالت سے کہا کہ اگر اسے قتل کی سزا نہ دی جائے تو وہ اپنے جتھے کے تمام چور گرفتار کرا دے گا۔ عدالت نے منظور کر لیا۔ اور ابن ساباط کی سزائے موت کو قید میں تبدیل کر دیا۔ اس کی نشاندہی پر سو سے کچھ زیادہ مجرم موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ان سو چوروں میں ایک بھی ایسا نہ ہو گا جس نے قتل ہونے سے پہلے ابن ساباط کے نام پر لعنت نہ بھیجی ہو۔ بدعہدی اور بے وفائی ایسی برائی ہے جسے بُرے بھی سب سے زیادہ برائی سمجھتے ہیں۔

ابن ساباط کو قید ہوئے دس برس ہونے کو ہیں۔ مگر اس کے جرائم کا ذکر بچے بچے کی زبان پر ہے۔ گرمیوں کا موسم ہے آدھی رات گزر چکی ہے۔ بغداد کے آسمان پر ستاروں کی مجلس آراستہ ہے مگر چاند نکلنے میں ابھی دیر ہے۔ دجلہ کے پار کرخ کی آبادی نیند کی خاموشی اور رات کی تاریکی میں گم ہے۔ اچانک تاریکی میں ایک متحرک تاریکی نمایاں ہوئی۔ سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا ایک آدمی خاموشی اور آہستگی کے ساتھ جا رہا ہے۔ یہ شخص ابن ساباط ہے۔ جو قید میں دس برس کی طویل زندگی گزار کر کسی طرح بھاگ نکلا ہے اور نکلتے ہی اپنا پیشہ از سر نو شروع کر رہا ہے۔ یہ اسکی نئی مجرمانہ زندگی کی پہلی رات ہے۔ اس نے ہر طرف کی آہٹ لی۔ مطمئن ہو کر آگے بڑھا۔ کچھ دور چل کر اس نے دیکھا ایک اصطبل کی دیوار دور تک چلی گئی ہے اور وسط میں بہت بڑا پھاٹک ہے۔ کرخ کے اس علاقے میں زیادہ تر امرا کے باغ تھے یا سوداگروں کے گودام تھے۔ اس نے خیال کیا یہ احاطہ یا تو کسی امیر کا باغ ہے یا کسی سوداگر کا گودام ہے۔ اس نے پھاٹک پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اسے نہایت تعجب ہوا کہ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ دہلیز سے قدم آگے بڑھایا تو ایک وسیع احاطہ نظر آیا۔ اس کے مختلف گوشوں میں چھوٹے چھوٹے حجرے بنے ہوئے تھے اور وسط میں نسبتاً ایک بڑی عمارت تھی۔ وہ درمیانی عمارت کی طرف بڑھا۔ عجیب بات تھی کہ اس کا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں تھا۔ چھوتے ہی کھل گیا۔ اندر جا کر دیکھا ایک وسیع ایوان ہے۔ لیکن سامان راحت و زینت کی کوئی چیز نہ تھی۔ قیمتی اشیاء کا نام و نشان نہ تھا۔ کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ایک پرانی چٹائی بچھی تھی۔ ایک طرف چیتھڑے کا تکیہ پڑا تھا۔ البتہ ایک کونے میں اونی کپڑے یعنی صوف کے چند تھان اس بے ترتیبی سے پڑے تھے جیسے کسی نے جلدی میں پھینک

دیئے ہوں۔ قریب ہی بھیڑ کی کھال کی چند ٹوپیاں بھی پڑی تھیں ابن ساباط یہ دیکھ کر سخت طیش میں آیا: "ہزار لعنت کرخ اور اس کے باشندوں پہ" وہ بڑبڑانے لگا۔ "معلوم نہیں کون احمق ہے جس نے یہ ملعون تھان جمع کر رکھے ہیں۔ کوئی تاجر ہوگا۔ لیکن عجیب تاجر ہے؟ جسے بغداد میں تجارت کے لیے کوئی اور چیز نہیں ملی۔ اتنا بڑا مکان بنا کر اس میں گدھوں اور خچروں کی جھول بنانے کا سامان جمع کر رکھا ہے۔" اس نے اپنے اکیلے ہاتھ سے ایک تھان کھول کر پیمائش کی: "بھلا یہ ملعون بوجھ کس طرح اٹھایا جا سکتا ہے۔ صوف کے ایک تھان کو اٹھانے کے لیے دس گدھے چاہئیں" کچھ نہ کچھ کرنا تو ضروری تھا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ دوسری جگہ تلاش کی جاتی۔ اس نے کوشش تو کی کہ زیادہ سے زیادہ تھان اٹھالے۔ مشکل یہ تھی کہ مال قیمت میں کم اور وزن میں زیادہ تھا۔ کم اٹھاتا تو فائدہ کچھ نہ ہوتا۔ زیادہ لیتا تو لے جا نہیں سکتا۔ دوسری مشکل یہ پیش آئی کہ صوف کا کپڑا بے حد موٹا تھا۔ اسے مروڑ کر گرہ لگانا آسان نہ تھا۔ دو ہاتھوں کے لیے یہ کام مشکل تھا۔ چہ جائیکہ ایک ہاتھ۔ کٹی ہوئی کہنی سے سرا دبایا دانتوں سے کام لیا۔ لیکن گرہ نہ لگ سکی۔

اچانک وہ چونک پڑا۔ اس کی تیز قوت سماعت نے قدموں کی نرم آہٹ سنی۔ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی حرکت کرتا ایک شخص ہاتھ میں شمع لیے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ابن ساباط جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ وضع قطع سے اس شخص کی شخصیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ نیلگے رنگ کی ایک لمبی عبا اس کے جسم پر تھی۔ جسے کمر کے پاس ایک موٹی رسی لپیٹ کر جسم پر چست کر لیا گیا تھا۔ سر پر سیاہ اونچی ٹوپی اور اس قدر کشادہ کہ اس کے کنارے ابروؤں کے قریب پہنچ گئے تھے۔ جسم نہایت نحیف، اتنا نحیف کہ صوف کی موٹی عبا کے باوجود ابھری ہوئی ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ قد کی درازی نے جسم میں کمر کے پاس خفیف سی خمیدگی پیدا کر دی تھی۔ کمزور جسم کے باوجود اس کا چہرہ کچھ عجیب طرح کی تاثیر رکھتا تھا۔ اس کی نگاہیں ایسی روشن اور مطمئن تھیں جیسے دنیا کی ساری راحت اور سکون ان دو حلقوں کے اندر سما گئی ہو۔ چند لمحوں تک یہ شخص شمع لیے ابن ساباط کو دیکھتا رہا، پھر یوں آگے بڑھا جیسے اسے جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ چکا ہے۔ چہرے پہ ہلکا سا زیر لب تبسم تھا۔ ایسا دل آویز اور شیریں تبسم جو انسانی روح کے سارے اضطراب اور خوف دور کر دیتی ہے۔ اس نے شمع کو ایک طرف رکھ دیا۔ شفقت اور ہمدردی میں ڈوبی ہوئی آواز میں ابن ساباط سے کہا: "میرے دوست! تم پہ خدا کی سلامتی ہو۔ جو کام تم کرنا چاہتے ہو وہ روشنی اور ایک رفیق کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ دیکھو یہ شمع روشن ہے اور میں تمہاری مدد کے لیے موجود ہوں۔ روشنی میں ہم دونوں اطمینان اور سہولت کے ساتھ یہ کام انجام دے لیں گے۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ کچھ سوچتے ہوئے پھر اس نے کہا: "میں دیکھ رہا ہوں تم بہت تھک گئے ہو۔ دیکھو یہ چٹائی بچھی ہے۔ یہ چمڑے کا تکیہ ہے۔ کچھ دیر آرام کر لو۔ میں تمہارا ادھورا کام پورا کیے دیتا ہوں۔" اب ابن ساباط نے دیکھا کہ اجنبی نے واقعی کام شروع کر دیا ہے۔ اور اس نے پہلے وہ گٹھڑی کھولی۔ جو ابن ساباط نے باندھنا چاہی تھی۔ مگر باندھ نہیں سکا تھا۔ وہاں جتنے تھان موجود تھے۔ ان سب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے میں زیادہ اور ایک میں کم۔ پھر دونوں کی الگ الگ گٹھڑیاں باندھ لیں۔ گٹھڑیاں باندھنے کے بعد ابن ساباط کے قریب جا کر کہا: "میرے دوست تمہارے چہرے کی پژمردگی بتا رہی ہے کہ تم صرف تھکے ہوئے ہی نہیں بلکہ بھوکے بھی ہو۔ بہتر ہوگا چلنے سے پہلے دودھ کا ایک پیالہ پی لو اور اگر تم چند لمحے انتظار کر سکو تو میں دودھ لے آؤں۔" اس کے پر شکوہ چہرے پہ بدستور مسکراہٹ کی دلآویزی موجود تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ اس مسکراہٹ سے انسانی قلب کے تمام اضطراب محو نہ ہو جائیں۔ اس سے پیشتر کہ ابن ساباط کوئی جواب دیتا، وہ تیزی کے ساتھ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

اب ابن ساباط تنہا تھا۔ اس کا دماغ الجھ کر رہ گیا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اجنبی کی ہستی اور اس کا طور طریقہ کچھ ایسا عجیب تھا کہ اس کی موجودگی نے ابن ساباط کو سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ دی۔ اب تنہائی ملی تو غور کرنے لگا کہ اس سارے معاملے کا مطلب کیا ہے؟ یہ شخص کون ہے؟ اس نے دل میں سوچا یہ شخص اس مکان کا مالک نہیں ہے۔ مالک مکان چوروں کا یوں استقبال نہیں کرتے۔ پھر یہ شخص ہے کون؟ اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ زور سے ہنسا: "میں بھی کیا احمق ہوں یہ بھی کوئی سوچنے اور حیران ہونے کی بات ہے۔ یقیناً یہ بھی میرا ہم پیشہ ہوگا۔ اسی نواح میں رہتا ہوگا۔ حالات نے ہم دو چوروں کو آج اسی مکان میں اکٹھا کر دیا ہے۔

اسی نواح کا آدمی ہے۔ مکان کے تمام حالات سے واقف ہوگا۔ کہ آج گھر والے گھر پر نہیں ہیں اور باطمینان کام کرنے کا موقع ہے۔ اس لیے وہ روشنی لے کر گیا ہے۔ لیکن جب دیکھا کہ میں پہلے سے موجود ہوں تو حصہ دار بننے کے لیے مدد پر آمادہ ہوگیا۔" وہ یہ سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور اجنبی لکڑی کا پیالہ لے کر نمودار ہوا۔ یہ لو میں تمہارے لیے دودھ لے آیا ہوں۔ اسے پی لو۔ یہ بھوک اور پیاس دونوں کیلئے مفید ہوگا۔ اور پیالہ ابن سابا ط کے حوالے کیا۔ ابن سابا ط بھوکا پیاسا تھا ہی۔ ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اب اسے معاملے کی فکر ہوئی۔ اس وقفے نے اس کی طبیعت بحال کر دی تھی۔ "دیکھو! اگرچہ میں تم سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا اور ہاتھ لگا چکا تھا۔ اس لیے قاعدے کے بموجب تمہارا کوئی حق نہیں بنتا۔ لیکن تمہاری ہوشیاری اور مستعدی دیکھ لینے کے بعد مجھے کوئی تامل نہیں کہ تمہیں بھی اس مال میں شریک کر لوں۔ اگر تم پسند کرو تو ہمیشہ کے لیے تم سے معاملہ طے کر سکتا ہوں۔ یعنی اس قسم کے کاروبار میں دونوں برابری کی بنیاد پر معاملہ طے کر سکتے ہیں۔ لیکن دیکھو آج جو کچھ ہم یہاں سے لے جائیں گے اس میں تم برابر کے حصہ دار نہیں بن سکتے۔ سمجھے۔ کیونکہ در اصل آج کا کام میرا ہی کام تھا۔" اس نے صاف آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں اب خوف نہیں تھا۔ تحکم تھا۔ اجنبی مسکرایا۔ اس نے ابن سابا ط پر ایک گہری نظر ڈالی جو شفقت و مہربانی سے خالی تو نہ تھی۔ اس نظر میں کوئی چیز بھی تھی۔ ابن سابا ط سمجھ نہ سکا۔ اس نے خیال کیا شاید یہ شخص اس طریق تقسیم پر قانع نہیں ہے۔ اچانک ابن سابا ط غصے سے مضطرب ہو کر کھڑا ہوگیا اور کہا "بیوقوف کہیں کا سمجھتا، دودھ کا ایک پیالہ پلا کر اور چکنی چپڑی باتیں کر کے تم مجھے احمق بنا لو گے، تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ مجھے کوئی احمق نہیں بنا سکتا۔ میں ساری دنیا کو احمق بنا چکا ہوں۔ بولو اس پر راضی ہو کہ نہیں اگر نہیں ہو تو۔ ....." "میرے عزیز دوست! کیوں بلا وجہ اپنی طبیعت آزردہ کرتے ہو۔ یہ کام جلد نبٹا لیں جو ہمارے سامنے ہے۔ دیکھو میں نے دو گٹھڑیاں باندھ لی ہیں۔ ایک چھوٹی ہے ایک بڑی۔ تمہارا ایک ہاتھ ہے اس لیے تم زیادہ بوجھ نہیں سنبھال سکتے لیکن میں دونوں ہاتھوں سے سنبھال لوں گا چھوٹی گٹھڑی تم اٹھا لو۔ بڑی میں اٹھا لوں گا۔ رہا میرا حصہ جس کے خیال سے تمہیں اتنی آزردگی ہو رہی ہے تو میں نہیں چاہتا کہ اسی وقت فیصلہ کیا جائے۔ تم نے کہا کہ تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے معاملہ طے کر سکتے ہو۔ مجھے بھی ایسا ہی معاملہ پسند ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ تمہیں نہیں معلوم میں کون ہوں۔ پورے ملک میں مجھ سے بہتر کوئی اور تمہیں نہیں مل سکتا۔" ابن سابا ط نے اجنبی کو گٹھڑی اٹھانے میں مدد دی۔ یہ گٹھڑی اسقدر بھاری تھی کہ ابن سابا ط اپنی حیرانگی نہ چھپا سکا۔ وہ اپنے نئے رفیق کی زیادہ حوصلہ افزائی کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ "دوست! تم دیکھنے میں تو بڑے کمزور ہو لیکن بوجھ اٹھانے میں بڑے مضبوط نکلے۔" ساتھ ہی اس نے اپنے دل میں کہا "یہ جتنا مضبوط ہے اتنا عقلمند نہیں ہے۔ ورنہ اپنے حصے سے دستبردار نہ ہو جاتا۔ اگر آج یہ احمق نہ مل جاتا تو مجھے سارا مال چھوڑ کر صرف ایک دو تھانوں پر ہی قناعت کرنا پڑتی۔ ابن سابا ط کو قدرتی طور پر جلدی تھی۔ وہ بار بار حاکمانہ انداز میں تیز چلنے کیلئے اصرار کرتا رہا۔ اس کا بوجھ بہت ہلکا تھا۔ اس لیے خود تیز چلنے میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اجنبی کی پیٹھ جس میں پہلے ہی سے خم موجود تھا۔ گٹھڑی کے وزن سے بالکل ہی جھک گئی تھی۔ اجنبی تعمیل حکم کی پوری کوشش کرتا۔ لیکن اتنا بھاری بوجھ اٹھا کر دوڑنا انسانی طاقت سے باہر تھا۔ کئی مرتبہ ٹھوکریں لگیں۔ لیکن ابن سابا ط اس پر بھی خوش نہ تھا۔ اس نے پہلے ایک دو مرتبہ تیز چلنے کا حکم دیا۔ پھر بے تامل گالیوں پر اتر آیا۔ ہر لمحے کے بعد ایک سخت گالی دیتا۔ اتنے میں دجلہ کا پل آگیا۔ یہاں چڑھائی تھی۔ جسم کمزور اور تھکا ہوا۔ بوجھ بے حد بھاری۔ اجنبی سنبھل نہ سکا۔ گر پڑا۔ ابھی وہ اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ایک لات پڑی۔ یہ ابن سابا ط کی لات تھی۔ اس نے غضبناک ہو کر کہا "ملعون اگر اتنا بوجھ سنبھال نہیں سکتا تھا تو لاد کر لایا کیوں؟" اجنبی ہانپتا ہوا اٹھا۔ اس کے چہرے پر دکھ و شکایت کی بجائے شرمندگی کے آثار تھے۔ اس نے فوراً گٹھڑی اٹھا کر پیٹھ پر رکھی اور پھر روانہ ہوگیا۔ اب یہ دونوں شہر کے کنارے ایک ایسے حصے میں پہنچ گئے جو بہت ہی کم آباد تھا۔ یہاں ایک پرانا اور شکستہ مکان تھا۔ جس میں ابن سابا ط نے قید خانے سے فرار ہو کر پناہ لے رکھی تھی۔ دونوں اس میں داخل ہوگئے۔

اجنبی بدستور ہانپ رہا تھا۔ گٹھڑیاں رکھنے کے بعد چند لمحے آرام اور خاموشی سے گزرنے کے بعد اجنبی ابن سابا ط کے سامنے آتا ہے۔ ابن سابا ط چاند کی روشنی میں دیکھتا ہے کہ ایک درخشاں چہرہ۔ ایک لازوال تبسم، ایک پر اسرار انداز نگاہ کی دلآویزی سامنے ہے۔ اجنبی نے دلنواز اور شیریں آواز میں کہنا شروع کیا "میرے

عزیز دوست! میں نے اپنی خدمت پوری کر لی ہے۔ اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ اس خدمت کے کرنے میں جو کوتاہی ہوئی۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ البتہ رخصت ہونے سے پہلے تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں وہ نہیں جو تم نے خیال کیا۔ میں اسی مکان میں رہتا ہوں۔ جہاں آج تم سے ملاقات ہوئی۔ تم نے میری رفاقت قبول کر لی۔ میری عادت ہے کہ رات کو تھوڑی دیر کے لیے اس کمرے میں جاتا ہوں۔ جہاں تم بیٹھے تھے۔ آیا تو دیکھا کہ تم اندھیرے میں بیٹھے ہوا اور تکلیف اٹھا رہے ہو۔ تم میرے گھر میں میرے عزیز مہمان تھے۔ افسوس! کہ آج اس سے زیادہ تمہاری تواضع اور خدمت نہ کر سکا۔ تم نے میرا مکان دیکھ لیا ہے۔ آئندہ جب کبھی تم کو ضرورت ہو بلا تکلف اپنے رفیق کے پاس چلے آیا کرو۔ خدا کی رحمت اور برکت ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔" یہ کہا اور آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کیا اور تیزی کے ساتھ باہر نکل کر روانہ ہو گیا۔ اجنبی خود تو چلا گیا۔ لیکن ابن ساباط کو ایک اور ہی عالم میں پہنچا دیا۔ اب وہ مبہوت اور مدہوش نہ تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ اس طرف تک رہا تھا جس طرف اجنبی گیا تھا۔ لیکن معلوم نہیں اسے کچھ سجھائی بھی دے رہا تھا یا نہیں۔

دوپہر ڈھل چکی ہے۔ لیکن ابن ساباط اب تک وہیں بیٹھا ہے۔ جہاں صبح بیٹھا تھا۔ رات والی دونوں گٹھڑیاں سامنے پڑی ہیں اور اس کی نظریں اس طرح ان پر گڑی ہیں گویا ان کی شکنوں کے اندر رات والے رفیق کو ڈھونڈ رہا ہے۔ پورا دن بیت چکا ہے وہ بھوک جس کی خاطر اس نے اپنا ایک ہاتھ کٹوایا تھا۔ اب اسے نہیں ستاتی۔ اس کے دماغ کی ساری طاقت صرف ایک نقطے پر سمٹ آئی ہے اور وہ رات والے اجنبی کی صورت ہے۔ وہ خود تو اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن اسے ایک ایسے عالم کی جھلک دکھا گئی جو اب تک اس کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ اس کی ساری زندگی گناہ اور سیہ کاری میں بسر ہوئی تھی۔ اس نے انسان کے متعلق جو کچھ سنا اور دیکھا تھا وہ یہ تھا کہ انسان خود غرضی کا پتلا اور نفس پرستی کی مخلوق ہے۔ وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے بے رحمی سے ٹھکرا دیتا ہے۔ سختی سے سخت سزا دیتا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ انسان محبت بھی کرتا ہے۔ اور اس میں فیاضی، بخشش اور قربانی کی روح بھی ہو سکتی ہے۔ بچپن میں اس نے خدا کا نام بھی سنا تھا۔ اور لوگوں کو خدا پرستی کرتے دیکھا تھا۔ نہ تو خود کبھی اسے مہلت ملی کہ خدا پرستی کی طرف متوجہ ہو۔ اور نہ کسی انسان نے کبھی اس کی ضرورت محسوس کی کہ اسے خدا کی طرف متوجہ کرے۔ جوں جوں اس کی شقاوت بڑھتی گئی۔ معاشرہ اپنی سزا اور سختی کی مقدار بھی بڑھاتا گیا۔ اجنبی کی پہلی ہی نظر اس کے دل میں اتر چکی تھی۔ لیکن وہ اپنی جہالت اور گمراہی کی وجہ سے اس کا مقابلہ کرتا رہا۔ اور حقیقت کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ جونہی اجنبی کے آخری الفاظ نے وہ پردہ ہٹا دیا جو اس نے اپنی آنکھوں پر ڈال رکھا تھا تو حقیقت پوری طرح عیاں ہو گئی۔ اس کی طاقت سے باہر تھا کہ اس تیر سے اپنا سینہ بچا لے جائے۔ جب وہ سوچتا کہ اجنبی چور نہیں تھا مکان کا مالک تھا۔ چور کو پکڑنے اور سزا دلانے کی بجائے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ اس کا جواب اس کی روح کے لیے ناسور اور اس کے دل کے لیے دہکتا ہوا انگارہ بن گیا۔ وہ جس قدر سوچتا روح کا زخم گہرا ہوتا جاتا۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ بغداد کی مساجد کے میناروں سے مغرب کی اذان کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ابن ساباط اپنے غیر آباد گوشے سے اٹھا۔ چادر جسم پر ڈالی۔ اور بغیر کسی جھجک کے باہر نکل گیا۔ اب اس کے دل میں خوف نہیں تھا۔ وہ سیدھا شہر کے اس حصے میں پہنچا۔ جہاں رات گیا تھا۔ مکان کے پہچاننے میں اسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ پاس ہی لکڑ ہارے کا جھونپڑا تھا۔ وہ اس کے پاس گیا اور پوچھا "یہ جو سامنے والا بڑا سا احاطہ ہے اس میں کون تاجر رہتا ہے؟" "تاجر!" بوڑھے لکڑ ہارے نے تعجب کے ساتھ کہا "معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔ یہاں تاجر کہاں سے آیا۔ یہاں تو شیخ جنید بغدادیؒ رہتے ہیں۔" ابن ساباط اس روحانی کیمیاگر کی شہرت سے شاید بے خبر نہ تھا۔ مگر صورت آشنا نہ تھا۔ وہ مکان کی طرف چلا۔ رات کی طرح اس وقت بھی دروازہ کھلا تھا۔ وہ بے تامل اندر چلا گیا۔ وہی رات والی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ رات والا تکیہ ایک طرف دھرا تھا۔ تکیے سے سہارا لگائے وہ عجیب اجنبی بیٹھا تھا۔ تیس چالیس آدمی ادب سے حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ وہ اجنبی تاجر نہیں تھا۔ اگر تاجر تھا بھی تو صرف رفع ضرورت تک۔ اتنے میں عشاء کی اذان ہوئی۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت جنید بغدادیؒ اٹھے تو ایک شخص بے تابانہ آگے بڑھا اور قدموں پر گر پڑا۔ اس کے دل میں سمندر کا تلاطم تھا۔ وہ آنکھ جو کبھی تر نہیں ہوئی تھی۔ آج

دریائے دجلہ بھر آیا تھا۔ جو سیلاب اب تک رکا رہا وہ اب نہیں رک سکا۔ شیخ نے شفقت سے اس کا سر اٹھایا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر زبان نہ کھل سکی۔ اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ جب نگاہوں کی زبان کھل جاتی ہے تو منہ کی زبان کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس واقعے کو کچھ عرصہ گزر چکا ہے۔ شیخ احمد ابن ساباطؒ کا شمار حضرت شیخ جنیدؒ بغدادی کے حلقے کے ان سالکین میں ہوتا ہے۔ جو سب میں پیش پیش ہیں۔ شیخ کہتے ہیں "میرے شاگردوں ابن ساباط نے وہ راہ لمحوں میں طے کر لی۔ جو دوسرے برسوں میں بھی طے نہ کر سکے۔" ابن ساباط چالیس برس تک اہل بغداد کیلئے قہر الٰہی بنا رہا۔ چالیس برس تک دنیا کی دہشت انگیز سزائیں اسے نہ بدل سکیں۔ مگر ایک روحانی کیمیاگر کے ساتھ چند لمحوں نے چور سے اہل اللہ بنا دیا۔ اس روحانی کیمیاگر نے نہ تو لمبی چوڑی تقریر کی۔ نہ جنت کی خوشخبریاں دیں۔ نہ عذاب جہنم کی بات سنائی۔ صرف دودھ کے ایک پیالے اور قربت کے چند لمحوں نے چالیس سالہ دل کی اجڑی دنیا کو سیراب و شاداب کر دیا۔ آخر یہ کونسی طاقت ہے۔ جو سوچ کو بدل ڈالتی ہے؟ وہ کونسی شے ہے جو دل پر جمی ہوئی تہہ کو آن واحد میں صاف کر دیتی ہے؟ ان سوالوں کا جواب تو کسی کیمیاگر کے قدموں پر دل کو رکھنے سے مل سکتا ہے۔ اصول فطرت ہے۔ یَھْدِیْ اِلَیْہِ مَنْ اَنَابَ۔

دوسرا منظر

چودھویں صدی ہجری کے وسط میں میانوالی کے ایک گاؤں چکڑالہ کے لق و دق صحرا میں ایک کیمیاگر کیمیائے سعادت کا پیغام لے کر ایک طوفان کی طرح اٹھتا ہے۔ کئی ابن ساباط کی قسمت کو ایک نظر میں بدل کر رکھ دیتا ہے۔ کسی کو کلب سے اٹھایا۔ کسی کو ابن سبا کے چنگل سے چھڑایا۔ کسی کو نام نہاد تصوف و بدعت سے بچایا۔ اور چھوڑا تو چودہ صدیوں کا سینہ چیر کر بارگاہ نبوی میں لا کھڑا کیا۔ اس نے لادینی قوتوں کے سامنے کھڑے ہو کر اس خلوص اور اس قوت سے انہیں للکارا کہ اس کی للکار ایشیا اور شرق اوسط سے گزرتی ہوئی مغرب کے آخری کونے تک سنائی دینے لگی۔ اس نے پکارا۔ اے بھٹکے ہوئے انسانو۔ اے زبانی جمع خرچ کے مسلمانو! آؤ میں تمہیں خمر عربی سے ملوا دوں۔ اس کی سنت پر چلنے کا ڈھنگ سکھا دوں۔ تمہیں ذکر الٰہی کا خوگر بنا دوں اور تمہارے قلب کی سوتی بستی کو آن واحد میں جگا دوں۔ ہے کوئی اس سعادت کا طالب؟ اس کی پُر درد آواز پر۔ ضلع چکوال کے قصبہ سیخی سے ایک نوجوان لبیک کہتا ہے۔ شاید فطرت نے اس نوجوان کو اس کیمیاگر کی نصرت کے لیے روز اول سے منتخب کر رکھا ہو۔ کیمیاگر کی کیمیا کو مزید بقا بخشنا منظور ہو۔ نصف صدی تک مردہ دلوں پر ضیا پاشی کرنے کے بعد یہ سورج اسی صحرا میں اٹھتا ہے۔ اس کا فن غروب نہیں ہوتا۔ اس کا فن اس کی تیز نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ ہاں دار دنیا میں اس فن کو چلانے کے لیے ایک کنڈولر کی بھی ضرورت ہے۔ اس فن کا ماہر وہ نوجوان امین قرار پاتا ہے۔ جس نے اس پر درد آواز پر لبیک کہا تھا۔ اس کیمیاگر کی پچیس سالہ رفاقت نے اسے صرف کیمیا ہی نہیں بلکہ کیمیا ساز بنا دیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان سازی کی ایک بھٹی ہے۔ ایک کارخانہ ہے۔ یہ محض میری عقیدت نہیں ایک زمانہ گواہ ہے

اس زمانے کے جہلاء کی عجب خرمستیاں ہیں کہ وہ فٹ پاتھ پہ بیٹھے ہوئے طوطا بازوں سے، مزاروں پہ دھمال ڈالتے ہوئے چٹا بازوں، سگریٹ پیتے دھوئیں سے مرغولے بناتے پیر نوسر بازوں سے۔ کرامات اور خارق عادات اور کیمیائے سعادت کی امیدیں لئے بیٹھے ہیں۔ کرامت کیا ہے؟ مانا کے مردے کو زندہ کرنا بھی کرامت ہے۔ لیکن ایک زندہ لاش کو جسے قرآن نے مردہ کہا ہے زندہ کر دینا بہت بڑی کرامت ہے۔ آیئے کرامت کی ایک جھلک بھی دکھا دوں۔ یہ جون ۱۹۸۷ء ہے۔ حضرت شیخ کی امریکہ سے واپسی ہے۔ لندن میں ایک دن کا قیام ہے۔ لندن کے احباب کا ایک واقف کار انڈین سکھ مجلس شیخ میں آجاتا ہے۔ کھانا حاضر ہونے پہ اسے بھی شریک طعام کیا جاتا ہے۔ کھانے سے فراغت پر مجلس ذکر کی تیاری ہے حضرت شیخ مدظلہ صرف اسے اتنا بتاتے ہیں کہ جس خدا کو تم مانتے ہو اسی خدا کو ہم بھی مانتے ہیں۔ ہم اسی خدا کا نام لینے لگے ہیں۔ مجلس ذکر میں وہ بیٹھ جاتا ہے مجلس ذکر ختم ہو جاتی ہے تو حضرت شیخ کی سفر کی تیاری ہے۔ وہ سکھ آگے بڑھتا ہے۔ عرض کرتا ہے کہ حضرت کلمہ طیبہ پڑھا کر جائیں۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اطلاع

ہر خریدار کو پرچہ باقاعدگی سے بھیجا جاتا ہے۔ تاہم اگر کسی وجہ سے پرچہ نہ ملے تو اس کی اطلاع اسی ماہ بھجوا دیجئے گا۔ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیج دیا جائے گا۔ مدیر المرشد

سفرنامہ

مدینہ منورہ، ۸ را پریل ۸۸ء

فاصلے

آج اپریل کی آٹھ تاریخ ہے۔ ابھی ابھی مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام تہجد سے فارغ ہو کر آئے ہیں اور اللہ کریم کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ " یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے " اللہ کریم کا احسان عظیم ہے کہ بہت جلد ہی جلدی دوبارہ حاضری نصیب ہو جاتی ہے۔ سو میں نے سفر کے حالات لکھنے چھوڑ دیے ہیں کہ ہر بار ایک ہی جیسے تو ہوتے ہیں کوئی نئی بات ہو تو لکھی جائے۔ اب یہ کیا لکھیے کہ یوں سیٹ ملی۔ یوں سفر کٹا، یوں آئے یوں گئے۔ مگر اب کے ایک نئی بات ہے جو میں قارئین کرام تک پہنچانا ضروری خیال کرتا ہوں یوں کہ اب کے بچے ساتھ تھے ان کا ارادہ بھی بدر کی زیارت کا تھا اور خود مجھے بھی خیال تھا کہ مدت گزری پھر وہاں حاضری نہیں ہو سکی۔ دراصل وقت کی کمی اور جہازوں کے سفر نے مل کر کوئی موقع ہی نہیں بننے دیا۔ اب کے پہلے سے ارادہ لے کر آئے تھے سو ۷ اپریل کو جدہ سے کار پہ نکلے اور ظہر کی نماز میدان بدر میں ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ پہلے غالباً ۲، ۳ بار میں حاضری ہوئی تھی یا ۳، ۴ بار میں اب سال ٹھیک سے یاد نہیں کہ پندرہ سولہ برس درمیان میں حائل ہیں اور برسوں کے فاصلے ہمیشہ یادوں کے نقوش دھندلا دیا کرتے ہیں۔ خیر تب یہ سارا میدان خالی تھا۔ شہداء کی قبور پہ سفیدی لگی ہوئی تھی اور دور پہاڑی کے دامن میں چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یاں سڑک پہ ہوٹل وغیرہ تھے جو اس زمانے کے مطابق تھے۔ مگر تھے بہت بڑے بڑے کھلے کھلے سے۔ سہ منزلہ، چارپائیاں سی پڑی ہوئی تھیں۔ اور لیٹنے والے تھے۔ مگر اب تو بات ہی دوسری ہے۔ ہوٹل بھی جدید بن گئے ہیں۔ بہت سی دکانیں بھی اور ساتھ پٹرول پمپ وغیرہ، نیز شہر پھیلتا ہوا سڑک تک آ گیا ہے۔ میدان بدر جہاں حق و باطل کا سب سے پہلا اور سب سے عظیم معرکہ برپا ہوا تھا درمیان میں رہ گیا ہے اور صرف اتنی جگہ خالی ہے جسے قبرستان قرار دے کر گرداگرد چار دیواری بنا دی گئی ہے۔ ورنہ تو فلک بوس عمارتیں، خوبصورت سڑکیں اور شاندار چوک دعوتِ نظارہ دیتے ہیں لیکن اگر دیدۂ دل وا ہو تو یہ سب کچھ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اصل بات وہ انوارات ہیں جو ان پہاڑوں کو ریگزاروں، میدانوں اور صحراؤں کو نصیب ہیں۔ اصل وہ نشانات ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک سے بنے۔ جو آج زمین کے سینے پہ چاند بن کر چمکتے ہیں یا وہ روشن نشان صحابہ کے قدم مبارک نے روشن کر دیئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ " اے اللہ میں سارے کا سارا اسلام کفر کے مقابلے پہ لے آیا ہوں اگر یہ لوگ آج یہاں کھیت رہے تو پھر قیامت تک کوئی جبین تیرے در سے آشنا نہیں ہوگی " یہی وہ میدان ہے جہاں لڑنے کو آسمان سے فرشتے نازل ہوئے تھے اور یہاں وہی شہداء آرام فرما ہیں جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں میں جانیں نچھاور کر دیں۔ کٹے ہوئے سینے، بکھرے ہوئے جسم اور خون آلود لباس میں سونے والے یہ لوگ کیا ہیں، نور کے مینار ہیں۔ عظمتوں کے نشان ہیں اسلام کی بنیاد ہیں۔ یہی وہ قیمتی پتھر ہیں جن پہ دین اسلام کی عمارت کھڑی ہے۔ بظاہر تو قبروں کے نشان مٹا دیے گئے ہیں مگر دل کی آنکھ کو دیکھنے سے کون روک سکتا ہے یہ روشنی حکومتوں کے اختیار میں نہیں۔ اس پہ شاہوں کا بس نہیں چلتا۔ یہ خداداد نعمت جسے اللہ کریم دے دیں۔ اس سے کوئی دوسرا چھین نہیں سکتا سو ہم بھی چار دیواری کے پاس کھڑے دیکھا کیے۔ ہمارے ڈرائیور صاحب نظر تھے۔ کہنے لگے جہاں جہاں کوئی شہید دفن ہے وہاں یوں نظر آتا ہے جیسے نور کا فوارہ ابل رہا ہو یا نور کا درخت ہو۔ مگر عجیب بات ہے سب درخت ایک برابر نہیں ہیں چھوٹے بڑے ہیں اور پھر میں نے ہی اس کی توجہ قلیب بدر کی طرف مبذول کروائی۔ یہ ایک گڑھا تھا جو وہاں قدرتی طور پہ بنا ہوا تھا۔ کفار مکہ کی نعشیں وہاں پھینکوا دی گئیں اور اوپر مٹی ڈال دی گئی کہ تعفن پھیل رہا تھا۔ یہی وہ گڑھا ہے جس کے اوپر کھڑے ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا " ہم

نے اللہ کا وعدہ سچ پایا تو کیا تم نے بھی سچ پا لیا یا نہیں "؟ تو سیدنا عمرؓ نے عرض کی "یا رسول اللہ کیا یہ سن رہے ہیں "؟ فرمایا "تم سے زیادہ مگر جواب نہیں دے سکتے "۔ اس سے مراد بھی یہ ہے کہ طریق عادی پہ جواب نہیں دے سکتے کہ ہر کوئی ظاہر کے کانوں سے نہیں سن سکتا۔ اور مرنے والے وہ بات بھی سن سکتے ہیں جو قبر پر بطور عادتِ انسانی کے کہی جائے مگر عجیب بات یہ ہے کہ چند قدم کا فاصلہ ہے۔ شہداء کی قبور کے ساتھ چھوٹی سی ٹیکری ہے یا مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیر جس پہ پتھر پڑے ہیں۔ اس کے ساتھ سے بارش کا پانی گزرتا ہے دوسری طرف بھی چھوٹی سی ٹیکری ہے مگر اس سے ذرا چھوٹی۔ ان کے درمیان ہی وہ مشہور گڑھا تھا۔ جو آج بھی دوزخ کی آگ سے بھڑک رہا ہے۔ اور شعلوں کی زبانیں دور تک لپکتی ہیں جیسے بھوکے اژدھے پھنکار رہے ہوں۔ میدان وہی ہے، مقام وہی ہے۔ پہاڑ اور ریگزار وہی ہیں۔ پھر قبروں میں تو چند قدموں یا چند گزوں کا فاصلہ ہے مگر حالت میں بہت لمبا فاصلہ ہے کہ ایک طرف جنت نچھاور ہو رہی ہے۔ نعمتیں ہیں، نور ہے۔ رحمتیں ہیں اور بخششیں بٹ رہی ہیں، آنے جانے والے بھی جھولی بھر کے لے جا رہے ہیں۔ مگر چند گزوں پہ دوزخ کی گرمی ہے تپش ہے، جہنم کے جانور ہیں، عذاب ہیں اور ایذائیں ہیں۔ اور مکے کے بڑے بڑے مشرک سردار چیخ رہے ہیں۔ چلا رہے ہیں نہ کوئی فریاد رس ہے، نہ داد کرنے والا، تو یہ فاصلہ کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ اس فاصلے کا تعلق زمین سے ہے، نہ زمانے سے، اس کا واسطہ ان تعلقات سے ہے جو ان لوگوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصیب تھے۔ جن کے تعلقات درست تھے انہوں نے نہ صرف آباؤ اجداد کی رسومات ترک کیں، ہبلوں کا عقیدہ چھوڑا۔ بلکہ گھر بار چھوڑا حتیٰ کہ جان بھی نچھاور کر دی۔ مگر تعلقات پہ آنچ نہ آنے دی۔ ان پہ اللہ کی جنتیں نچھاور ہو رہی ہیں۔ جنہوں نے باپ دادا کی رسومات عزیز رکھیں، رواجات عزیز رکھے، ان پہ جان دی۔ اب ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں۔ جن کی فریاد اللہ نہیں سنتا۔ ان کی بات سننے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ فاصلے تعلقات کے ہیں، معاملات کے ہیں، واسطوں کے ہیں۔ تو کیا ہم بھی اپنے تعلقات پہ نظرِ ثانی نہ کر لیں؟ کیا ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رسومات کو چھوڑا ہے؟ توہمات کو چھوڑا ہے؟ ناپسندیدہ عادات کو چھوڑا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو کہیں یہ فاصلہ ہمارے تعلقات میں نہ آ جائے اور نہ خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر کوئی دوسری ہستی ہمارے لیے بھی امداد کا باعث نہ بن سکے گی۔ سو ہمیں عقائد میں، اعمال میں، سوچ میں، کردار میں، فاصلوں کو کم ہی نہیں کرنا مٹانا ہو گا۔ اللہ کریم ہمیں اس کی توفیق ارزاں فرمائیں۔

مکہ مکرمہ، ۱۰ اپریل ۸۸ء

انجام

کل صبح مسجد نبوی شریف میں حاضری دی اور سلام عرض کرنے کے لیے روضہ اطہر کی طرف بڑھا مگر یہ سوچ کر کہ بھیڑ ذرا کم ہو لے بیٹھ گیا۔ احباب بھی ساتھ تھے۔ آدھ پون گھنٹہ بیٹھے ہوں گے کہ رش تقریباً ختم ہو گیا ہم آگے بڑھے تو روضۂ اطہر کے سامنے اصحاب صفہ کے چبوترے کے قریب پہلے محراب کے اندر ایک آدمی فوت ہو چکا تھا۔ لوگ جمع تھے جنہیں شرطے منتشر کر رہے تھے۔ شوق پیدا ہوا کہ اس خوش نصیب کی زیارت ہی ہو جائے جس نے درِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ جان دی ہے۔ پہلے سن رکھا تھا کہ شیدی نے یہ شعر کہا تھا۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

تو اس کا یہ شعر اس درجہ مقبول ہوا کہ زیارت نبوی کو حاضر ہوا تو جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ سبحان اللہ کہنے والے نے کس درد سے کہا ہو گا مگر سننے والے کے کرم کی بھی انتہا نہیں سو ہم شرطوں کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھے مگر یہ کیا مرنے والا اس رخ پڑا ہوا تھا کہ دونوں پاؤں اصحاب صفہ کے چبوترے کی طرف تھے۔ خالی ہاتھ دونوں اطراف کو پھیلے ہوئے تھے اور منہ بائیں طرف مڑا ہوا تھا۔ حالانکہ قبلہ بھی اس کے دائیں رخ تھا مرنے سے پہلے گورا چٹا تھا مگر اب چند لمحوں میں چہرہ سیاہ سے سیاہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ دل دہل گیا خدایا یہ کیسا انجام ہے یہ کس حال

کے آثار ہیں اور یہ کس راستے کے نشان ہیں۔ ہم آگے بڑھ گئے ریاض الجنۃ سے گزر کر جالی مبارک کے سامنے گئے۔ عبدالرقیب ساتھ تھا۔ وہ بھی اپنی استعداد کے مطابق انوارات کا مشاہدہ تو کرتا رہتا ہے مگر کس ہے فرق سمجھنا اس کے بس کی بات نہیں۔ ہاں یہ ضرور جان رہا تھا کہ مسجد نبوی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کہاں تک تھی اور بعد میں کہاں سے بڑھائی گئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا محراب کونسا تھا۔ حنانہ ستون کے بارے خاص طور پہ پوچھ رہا تھا پھر ہم چلتے چلتے جالی مبارک کے سامنے پہنچے تو عجیب بات ہوئی۔ بتایا کہ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں۔ تو کہنے لگا ابو مجھے دونوں قدم مبارک نظر آرہے ہیں بہت سفید ہیں جیسے روشنی کے بنے ہوئے ہوں۔ یہ بھی ان کا کرم ہے ورنہ اسکی عمر ہی کیا ہے ابھی پورے سات سال کا بھی شاید نہ ہوگا بھلا رخ انور کی تاب کہاں لا سکتا تھا۔ ایسے ہی شیخین رض کی خدمت میں سلام عرض کیا اجازت چاہی اور واپسی کا سفر شروع ہوا یہ تو جدہ تک جہاز سے تھا جدہ آرام کیا۔ عصر کے بعد روانہ ہوئے۔ شام تک عمرہ سے فارغ ہو سکے۔ پھر احباب کے ساتھ ذکر نصیب ہوا۔ الحمد للہ ہر جگہ ایسے ہی لوگ مہیا فرما دیتے ہیں جو صرف اللہ کے لیے دوستی رکھتے ہیں اور بس رات آرام کیا صبح ذکر کے بعد کچھ دیر حرم شریف بیٹھے کہ بچوں کا اصرار تھا حجر اسود کو بوسہ دیں گے۔ سو جب کچھ بھیڑ کم ہوئی لوگ ناشتے وغیرہ کے لیے چلے گئے تو ہم نے طواف کیا اور حجر اسود کو چومنا بھی نصیب ہوا۔ بچوں کو بھی اور ملتزم پہ دعا مانگنے کی جگہ بھی مل گئی۔ بشیر بھائی بھی بچوں سمیت آئے ہیں سو اہلیہ کو ساتھ تو مل گیا۔ واپس آئے ناشتہ کیا اور زیارت کے لیے چلے گئے اصل یہ عمرہ تھا ہی زیارات کے لیے کہ اہلیہ حج پہ تو زیارات کر نہ سکی تھیں نہ اس وقت ایسا کرنا ممکن ہی ہوتا ہے۔ سو پھر اس کے لیے عمرہ کی سعادت نصیب ہو گئی۔ الحمد للہ ہم آج صبح کار پہ نکلے ساتھی ساتھ دوسری گاڑی پہ تھے سب سے پہلے غار ثور کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے تقریباً ایک تہائی پہاڑ تک موٹر چلی جاتی ہے اس لیے نہیں کہ زائرین کی سہولت کے لیے سڑک بن گئی ہے وہاں بجلی کے بڑے بڑے پول نصب کئے جا رہے ہیں جہاں تک کمپنی کی گاڑیوں کو بہر حال جانا ہوتا ہے سو ہماری کاریں بھی اس کھمبے تک چلی گئیں وہ ایسی جگہ تھی جہاں سے وہ بڑا پتھر بھی نظر آرہا تھا جس کے نیچے غار ثور ہے۔ اور دوسری طرف کا وہ پہاڑی سلسلہ بھی جس طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر صدیق رض کے کاندھوں پہ سوار ہو کر وہاں تک پہنچے۔ کچھ تو احباب نے پوچھا، گھر والوں نے سوال کئے اور کچھ خود میرے دل میرے ضمیر کے سوالات تھے۔ گھر والوں اور دوستوں کو سوالات کے جوابات تو میں نے دیئے انہیں بتایا انہیں سمجھایا مگر اب میرے دل مجھے کون بتائے گا۔ میرے سوال کا جواب کہاں سے آئے گا میں پاگل ہو گیا ہوں یا ہو رہا ہوں کہ ابھی اتنا ہوش باقی ہے جس سے اپنے پاگل پن کا احساس ہے۔ دوستوں نے گھر والوں نے وہ حالات اور واقعات پوچھے جو تاریخ کا حصہ ہیں جو آپ سب جانتے ہیں۔ آپ نے کیسے ہجرت کی کعبہ شریف تشریف لائے۔ ابو بکر رض کے گھر تشریف لے گئے۔ آپ کی صاحبزادی حضرت اسماء رض نے ستو وغیرہ اپنا دوپٹہ پھاڑ کر باندھ دیئے اور شہر سے اس پہاڑ کے ساتھ ساتھ تشریف لائے جو اس چھوٹے سے ریت کے میدان سے گزرگاہ کو ملا دیتا ہے یہاں تک پاؤں مبارک زخمی ہو گئے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رض نے کاندھوں پہ اٹھایا اور پہاڑی پہ چڑھنا شروع کر دیا پھر اگلی چوٹی پھر اگلی چوٹی پھر اگلی چوٹی اور پھر غالباً آخری بلند ترین چوٹی جس پہ غار ثور تھا تک پہنچے۔ پہلے غار کو صاف کیا جہاں جہاں کوئی سوراخ نظر آیا اپنی قبا مبارک پھاڑ کر اس کو بند کر دیا اندر جگہ درست کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اندر بلا لیا گود میں سر مبارک رکھ لیا آپ نے آرام فرمایا۔ اسی جگہ آپ رض کا غلام بکریاں لاتا اور دودھ دوھ کر پیش کرتا۔ نیز مکہ کی خبریں عرض کرتا پھر اسی جگہ تلاش کرنے والے بھی پہنچے غضب کے کھوجی تھے۔ غار کے منہ تک لے گئے مگر حفاظت کرنے والے کی بے نیازی دیکھئے مکڑی کو فرمایا منہ پہ جالا تن دو یعنی یہ اتنے کمزور اور حقیر ہیں کہ انہیں روکنے کے لیے کسی فوج کی ضرورت نہیں کوئی شیر بٹھانے کی ضرورت نہیں کسی اژدہے کی ڈیوٹی لگانے کی حاجت نہیں نہ فرشتوں کو کھڑا کرنا ضروری ہے۔ بس ان کے لیے مکڑی کا جالا کافی ہے۔ واہ میرے مالک تیری شان۔ کائنات کی عظیم ترین نعمت کی حفاظت اس کے بدترین دشمن سے کس طرح فرمائی۔ یہ تو وہ باتیں تھیں یا ان باتوں کا خلاصہ جو میں نے احباب سے عرض کیں اب میرا سوال خود اپنے سے بھی اور آپ سے بھی یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی قبل بعثت بھی بہت زیادہ عزت تھی خاندانی وجاہت کو بھی اس لیے ضروری دخل تھا۔ اور آپ کے ذاتی اوصاف اسکا بہت بڑا سبب تھے حتیٰ کہ اہل مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صادق، امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ جھگڑوں کے فیصلے آپؐ سے کرواتے حجر اسود کے نصب کرنے پر بہت بڑے فتنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دانشمندی اور پیغمبرانہ بصیرت ہی کام آئی تو پھر آپؐ سے اس قدر برہم کیوں ہوئے اتنے بگڑے کیوں۔ اس قدر دشمنی کس لیے کہ ہجرت پہ مجبور ہونا پڑا پتھر کھانے پڑے، طعنے سننا پڑے، ایذا برداشت کرنا پڑی جنگیں لڑنا پڑیں۔ رخ انور زخمی ہوا، دندان مبارک شہید ہوئے خدام نے قدموں میں جانیں دیں۔ آخر یہ سب کس لیے ایسا کیوں ہوا صرف اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا اللہ کی کتاب پیش فرمائی۔ ان کی رسومات ان کے عقائد ان کے اعمال کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، بتوں کی خدائی کا نہ صرف انکار فرمایا بلکہ اسے چیلنج فرمایا اور اس پہ اہل مکہ کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹھن گئی۔ مگر ٹھہریئے کیا مکہ والوں نے صلح کی کوئی کوشش بھی کی یا صرف جنگ کی باتیں کرتے رہے۔ نہیں صلح کی بہت کوشش کی اس حد تک کہ نہ آپ ہمارے خداؤں کا انکار کریں نہ ہم آپ سے چھیڑ کرتے ہیں بلکہ اس حد تک گئے کہ اگر چاہو تو عرب کی حسین ترین عورت آپ کو پیش کر دیں۔ دولت چاہو تو اتنی جمع کر دیں کہ عرب میں کسی کے پاس نہ ہو۔ حکومت چاہو تو ہم آپ کو بادشاہ تسلیم کرتے ہیں مگر جانتے ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا جواب ارشاد فرمایا۔ فرمایا تم زمین کی نعمتوں کی باتیں کرتے ہو اگر تم میرے ہاتھ پہ چاند اور دوسرے پہ سورج لاکر رکھ دو تو بھی اپنے رب کا پیغام ضرور پہنچاؤں گا۔ تب بات جنگ تک پہنچی پھر جو ایذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برداشت فرمائی اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد کافی ہے کہ جسقدر ایذا مجھے دی گئی کسی نبی اور کسی رسول کو نہیں دی گئی۔ آپؐ کے ساتھ ایمان لانے والے آپ کے جاں نثاروں نے جو تکالیف برداشت کیں بیان سے باہر ہیں اور پھر اندھیری رات میں ہر قبیلے کے جوان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کو گھیر لیا کہ قتل کیے بغیر نہ ٹلیں گے۔ بنو ہاشم کس کس سے انتقام لیں گے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے کعبۃ اللہ سے ملاقات فرمائی۔ ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لیا۔ رات کی تاریکی دشمن کا خوف اور کائنات کی نعمت کاندھوں پہ ہے۔ حتیٰ کہ غار میں ہیں تو دشمن دروازے تک آپہنچے۔ یہ سب کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسلام کیلئے برداشت فرمایا جس پہ عمل ہمارے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ آج ہم مغربی تہذیب سے مرعوب انگریز بن کر طواف کرنے بھی آتے ہیں۔ نماز کے لیے اٹھنا دوبھر ہے۔ زکوٰۃ کا ہم اہتمام نہیں کرتے رمضان سے ہمیں لگاؤ نہیں۔ وضع میں نصاریٰ، معیشت میں یہود اور رسومات میں ہندو ہمارے پیشوا ہیں۔ میرا دل میرا ضمیر مجھ سے پوچھ رہا ہے بتاؤ کیا تم اس حال میں مر گئے تو کہاں جاؤ گے۔ کس کے پاس پہنچو گے۔ تمہارا انجام کیا ہو گا اور میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ حیلے ہیں بہانے ہیں۔ باتیں ہیں مگر جواب نہیں، آپ کے پاس ہے تو بتا دیں کہ میں دل کو ضمیر کو خاموش کر سکوں، اسے سمجھا سکوں۔ کاش کوئی بتا سکے ہمارا انجام کیا ہے۔ کیا ہماری سمت بدل جائے گی۔ رخ مڑ جائے گا۔ رنگت سیاہ ہو جائے گی اور جدھر سر ستارہ ہوتے ہیں ادھر پاؤں ہوں گے۔ اللہ کریم ہمیں اس انجام بد سے بچا لے تجھے سب توفیق ہے ہمارے گناہ معاف فرما اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نصیب فرما۔ آمین۔

حنیف تھداری

اعتکاف

جو حضرات اعتکاف کے لیے تشریف لانے کے خواہشمند ہیں وہ ۲۰ رمضان المبارک عصر تک دارالعرفان، منارہ پہنچ جائیں۔ اپنے علاقے کے امیر یا متعلقہ صاحب مجاز سے تحریری اجازت نامہ لانا لازمی ہے

کوئٹہ کا دورہ

حضرت کرم کا دورہ کوئٹہ، جس کی تاریخ ۲۲ مئی سے ۲۷ مئی تک تھی، فی الحال ملتوی کر دیا گیا ہے۔ آئندہ تاریخ کا اعلان بعد میں کر دیا جائے گا۔

ابلیس ایک ایسا تجربہ کار فنکار ہے کہ اللہ کا روپ بھی اسے کامیابی کے ساتھ دھار لیتا ہے کہ نقل کا شبہ تک نہیں ہونے دیتا۔ ہر دور میں اس کے شاگردوں کی تعداد بے شمار رہی ہے۔ جو شخص حق کی تلاش میں نکلتا ہے، یہ بہروپئے ہر موڑ پر استقبال کو کھڑے ہوتے ہیں۔ طالب حق کے لیے پہچان کا مسئلہ پیدا کرتے ہیں:

راہِ حق کا مسافر کئی بار 'سراب' کو ہی منزل سمجھ بیٹھتا ہے۔ لیکن مقصد کی لگن اور منزلِ حق کی کشش اسے رواں رکھتی ہے۔ رائی کے ان پہاڑوں کو ڈھاتا ہوا۔ عقائد و نظریات کے خشک اور تپتے دشت صحراؤں سے گزرتا ہوا حق کے لہلہاتے سبزہ زاروں میں پہنچ ہی جاتا ہے۔

محمد طیب خاں کچھ ایسے ہی خارزاروں، صحراؤں اور ویرانوں سے گزرے ہیں۔ اپنے تجربات کو خلوص کے ساتھ قلمبند کر لینا اور دوسروں تک پہنچانا ایک جرأت مندانہ فعل ہے۔

میں یہاں تک کیسے پہنچا

محمد طیب خان

درس نظامی کرنے کے بعد کسی مردِ کامل کی تلاش مجھے کیوں لگتا تھا کہ ہمارے دور میں یہ محال نہ سہی مشکل ضرور ہے۔ تصوف پر لکھی جانیوالی کافی کتب پڑھنے کے بعد، موافق اور مخالف دونوں آراء میرے سامنے تھیں۔ نظریاتی طور پر میں منکرین تصوف کا مخالف تھا لیکن عملی میدان خالی پاکر عملاً بلا اختیار نہ ماننے والوں سے ہم آہنگی کا احساس ہوتا تھا۔ کتب تصوف کے علاوہ حاملین رشد و ہدایت سے ملاقات کا سلسلہ بھی جاری تھا اور مزاروں کی حاضری بھی ہوتی رہی لیکن حاضری کا یہ عالم تھا کہ جس مزار پر ایک دفعہ جانے کا اتفاق ہوا۔ دوسری دفعہ شاید ہی جانے کو دل چاہا۔ کیونکہ جو "بت شکن" تھے، انہیں "بت گر" ثابت کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جا رہا تھا۔ گدی نشینوں سے مل کر تو یہ نظر بہ پختہ ہوتا گیا۔

"زاغوں کے تصرف میں ہیں عقابوں کے نشیمن"

اور مزاروں پر جاکر حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تفسیر سمجھ میں آئی کہ جو لوگ بزرگوں کو پوجتے ہیں۔ بزرگ تو بے گناہ ہوتے ہیں۔ درحقیقت ایک شیطان اپنا وہی نام رکھوا کر خود کو پجواتا ہے۔ اسی لیے وہ (بزرگ) کہیں گے تم جھوٹے ہو"

مزاروں پر جاکر شیطانوں کی کارستانیوں کا بڑی حد تک ادراک ہو گیا تھا اور حضرت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا یہ نکتہ واضح ہوتا رہا کہ اولیاء اللہ پر لوگوں نے دوہرا ظلم کیا ہے۔ جب تک یہ لوگ زندہ رہتے ہیں، ان کی بات کا انکار کیا جاتا ہے۔ اور جب مر جاتے ہیں تو ان کی پرستش شروع ہو جاتی ہے۔ جوں جوں اس میدان میں آگے بڑھتا گیا عجیب و غریب مناظر دیکھنے میں آتے رہے۔ لاہور، پاک پتن اور سلطان باہوؒ کے مزار کے علاوہ دیگر کئی مزاروں پر جانے کا اتفاق ہوا مگر ہر جگہ شرک و بدعت کا بازار گرم دیکھا۔ مختلف گدی نشینوں کے پاس جانے کا اتفاق ہوا۔ گولڑہ شریف جہاں پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ وہاں بھی سوائے طبلے کی تھاپ پہ قوالی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جمعہ کی اذان بھی ہو گئی مگر صاحبزدگان قوالوں کے جھرمٹ میں نذرانے لے رہے ہیں۔ انتہائی تلخ تجربہ تھا۔ لکھتے ہوئے دل پھٹتا ہے پھر ضلع ہزارہ میں ایک صوفی سے ملاقات کا موقع ملا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب موصوف کو عید مبارک کے دن اپنے والدین کی قبروں پہ سجدے کرتے دیکھا۔ اب میں اس وادیٔ پُر خار میں بہت احتیاط سے چلنے لگا۔

غالباً ۱۹۸۰ء کا ذکر ہے کہ لاہور میں ایک عزیز نے بتایا کہ ایک پیر صاحب آئے تھے اور انہوں نے سانس کے ساتھ ذکر کرایا ہے۔ لیکن سابقہ تجربات کی بنا پر میں نے تحقیق نہ کی اور بات آئی گئی ہو

گئی۔ پانچ سال بعد میر پور اپنے ایک عزیز کے پاس رات ٹھہرنے کا موقعہ ملا۔ ان سے پہلی دفعہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کا لٹریچر پڑھنے کو ملا۔ ان کے اعمال نے بہت متاثر کیا۔ سنت کا بہت شدت سے اہتمام اور تہجد کا قیام اور ذکر پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ۔ ایسی باتیں تھیں جس نے دل کو بیحد متاثر کیا۔ پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ دنیا اب بھی اللہ کے بندوں سے خالی نہیں۔ کافی لٹریچر پڑھ لیا تھا اور کبھی کبھی ذکر بھی کرنے کی سعی کرتا۔ مگر طریقہ ذکر اور روحانی بیعت جیسے موضوعات مجھے اب تک سمجھ نہ آئے تھے۔

میرا تبادلہ کوئٹہ ہوا تو وہاں ایک میجر صاحب سے ملاقات ہوئی جو سٹاف کالج کے لیے کوئٹہ آئے ہوئے تھے۔ میں انہیں پہلے سے جانتا تھا۔ لیکن اب ان میں نہایت خوشگوار تبدیلی آچکی تھی وہ چہرے پر خوبصورت سنت سے مزین میرے سامنے کھڑے تھے۔ اور ذکر کی باتیں اور اپنے مشاہدات اور تاثرات بیان کر رہے تھے۔ میرے لیے تو اتنا کافی تھا کہ سنت سے متنفر شخص کو عامل سنت کرنیوالا ضرور کوئی بڑا آدمی ہے۔ اب میں سلسلہ سے کافی حد تک متعارف ہو چکا تھا۔ میں رابرٹ مارکیٹ میں ذکر کی مجالس میں باقاعدگی سے شرکت کرنے لگا۔ اب مجھے لطائف اور ان کے رنگوں کے بارے میں تفصیل سے پتہ چلا۔

۱۹۸۱ء میں اوکاڑہ تبادلہ ہوا۔ یہاں بھی ذاکرین کا وجود میرے لیے باعث سعادت بنا۔ شمس الحق صاحب جیسے مخلص اور بے لوث افراد نے میرے حوصلے کو اور بلند کیا۔ ذکر کی مجالس سے محبت میں اضافہ ہوتا گیا۔ کبھی کبھی دل میں طریقہ ذکر کے بارے میں وساوس جنم لیتے اور شبہ ہوتا کہ کہیں بدعت کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو۔ دل میں خواہش بڑھتی گئی کہ کیوں نہ مرکز کی طرف پیشقدمی کی جائے۔ لیکن مختلف تشبیب و فراز دیکھنے کے بعد میں نے استخارہ کیا۔ میرے سامنے اب دو ہستیاں تھیں، ایک لاہور شاہدرہ میں اور دوسرے حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ۔ جب استخارہ کر لیا تو انتخاب حضرت جی کا ہو چکا تھا۔ اب دیدار کا شوق بڑھتا جا رہا تھا۔ چنانچہ اوکاڑہ سے ارشاد گل عزیز صاحب، شمس صاحب اور میں یکم جنوری ۱۹۸۲ء بروز ہفتہ میانوالی (چکڑالہ حضرت جی کے پاس جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ کار عزیز صاحب چلا رہے تھے اور ہم لوگ آہستہ آہستہ چکڑالہ (مرشد آباد) کی حدود میں مغرب کے وقت داخل ہوئے۔

حضرت جیؒ کے پاس مغرب کے بعد پہنچے۔ حضرت جیؒ کے خدام نے بڑی آؤ بھگت کی اور حضرت سے صبح ملاقات کا مژدہ سنایا۔ رات اضطراب میں کٹی۔ ذکر دونوں وقت ہوا۔ کافی لطف آیا۔ صبح سویرے ہی صحن سے ایک بزرگ ہاتھ میں لاٹھی، کھدر کے کپڑے زیب تن کئے ہوئے آہستہ آہستہ ہمارے کمرے کی طرف آرہے تھے۔ پتہ چلا کہ یہی وہ ہستی ہے جس نے ہزاروں گمراہ، خدا فراموش اشخاص کو راہ راست پر لا کر خدا آگاہ کر دیا تھا۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ مگر چہرہ بارعب اور آنکھوں میں بلا کی چمک۔ آتے ہی بڑی شفقت سے ملے اور کمبل اوڑھ کر تشریف فرما ہوئے۔

میں اپنے ذہن میں چند سوال لے کر حاضر ہوا تھا۔ ممکن تھا میرے ہمسفر رفقاء کے بھی کچھ سوالات ہوں گے۔ مگر مجھے تو سوالات پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

حضرت جی نے میرے سوالات کا جواب دینا شروع کیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ شاید میرے سوالات کسی نے انہیں بتا دیئے ہوں۔ حالانکہ ایسا تو ہرگز نہیں ہوا۔ لیکن سوال کا جواب، سوال بیان کئے بغیر مل رہا تھا۔

میرے والد صاحب ۱۹۷۲ء میں حج کے لیے پیدل تشریف لے گئے۔ حج کے بعد انہوں نے خط لکھا کہ پاسپورٹ گم ہو گیا۔ بنوا کر بھیجا جائے۔ بڑے بھائی نے پاسپورٹ بھجوا دیا۔ تب سے آج تک ہمیں ابا جی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ میں نے ذہن میں ان کے بارے میں حضرت جی سے استفسار کا سوچا تھا۔ حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اولیاء اللہ کی مثال اسطرح ہے۔ ؎

گہے بر طارم اعلیٰ تفینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

(کبھی تو وہ آسمان کی خبریں بتا دیتے ہیں اور کبھی انہیں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے پاؤں کے نیچے کیا ہے) مجھے سمجھ آگئی کہ یہاں تو لان زنی والا معاملہ نہیں ہے۔ کس قدر عمدہ جواب تھا اچھی بات ہے مجھے تو حد سے بڑھ کر اطمینان ہوا۔ الحمد للہ کہ اللہ کریم نے ایسے مرد حق سے نسبت عطا کی۔ ورنہ "من آنم کہ من دانم"

حضرت جیؒ نے فرمایا کہ صحابہ کے کمالات وہبی تھے اور ہمارے کسبی۔ انہیں مجاہدات کی ضرورت نہ تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نظر سے صحابی بن گئے۔ اور وہ مقام ملا کہ سارے اولیاء ملکر بھی ادنیٰ ترین صحابی کے قدموں کی خاک تک نہیں پہنچ سکتے۔ فرمایا

صحابی وہ ہے جس نے آپؐ کو ایمان کی حالت میں دیکھا یا جسے آپؐ نے دیکھا۔ یہ طریقہ ذکر جسے ہم لوگ اپنائے ہوئے ہیں یہ مقصود نہیں ہے بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ سر کا ہلانا تو ایسے ہی ہے جیسے عورت آٹا گوندھتے ہوئے ہلتی ہے۔ حالانکہ مقصد آٹا گوندھنا ہے نہ کہ ہلنا۔ اسی طرح ہلنا ذکر میں مددگار ثابت ہوتا ہے، خود مقصود نہیں۔ اگر کوئی ہلے بغیر ذکر کر سکتا ہے تو ہمیں کیا اعتراض۔ یہ میرے دوسرے سوال کا جواب تھا کہ یہ طریقہ تو صحابہ سے ثابت نہیں جس طریقے پہ ہم لوگ ذکر کرتے ہیں۔ حضرت کا یہ خوبصورت جواب میرے دل کی گہرائی میں اتر گیا۔

روحانی بیعت کے ضمن میں فرمایا کہ شاہ ولی اللہؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی بیعت یافتہ تھے۔ آپ بہت ساری کتابوں کے مصنف ہیں۔ مگر "تفہیمات" اور "انتباہ فی سلاسل اولیاء" بے نظیر کتابیں ہیں۔ فرمایا روحانی بیعت میں آپ حضورؐ کو دیکھ لیں روحانی طور پہ، ورنہ حضورؐ تو آپ کو روحانی طور پر دیکھ ہی رہے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ باتوں سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ ہاں طلب صادق ہو تو یہاں چالیس دن کوئی رہے اور میرے پاس کھانا بھی کھائے، کہ رزق حلال کے بغیر تو کوئی عبادت ہی قبول نہیں ہوتی پھر وہ خود دیکھ لے گا کہ روحانی بیعت کیا ہوتی ہے؟ یہ میرے تنبیہ سے کا ازالہ تھا۔ میرا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔ اور اپنے سوالات کا جواب پا کر دل انتہائی فرحت محسوس کر رہا تھا۔ گویا کہ بہت بڑا بوجھ سر سے اتر گیا۔ واقعی اقبال علیہ الرحمۃ نے ٹھیک کہا ہے۔

ع نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں یہ اپنی آستینوں میں

تصوف کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصب "ویزکیھم" مستقل ذکر ہوا ہے۔ جسے اولیاء اللہ نے سنبھالا ہے۔ دین کا باطنی پہلو جو درحقیقت اخذ دین کا بڑا ذریعہ ہے وہ یہی تصوف اور تزکیہ نفس ہے۔ چنانچہ حضرت جبرائیل امینؑ قرآن پاک کی آیات لے کر آنحضرتؐ کے پاس آتے تو آپ جلدی جلدی یاد کرنے کی کوشش فرماتے۔ اللہ کریم نے فرمایا "آپ زبان کو حرکت نہ دیں اس کا جمع کرنا اور اسے پڑھنا ہمارا کام ہے" (القیامۃ) یہ سارا باطنی طور پہ آنحضرت کو القا ہوا اور باطنی علوم کے وارث اولیاء ہیں اور علوم انعکاسی طریق سے صحبت میں بیٹھنے والے کے سینے میں بقدر استطاعت منتقل ہوتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریمؐ کی خدمت میں آیا اور اس نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں۔ اس کے بعد کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں۔ اُس نے پھر پوچھا: اس کے بعد کون؟ آپؐ نے پھر فرمایا: تیری ماں۔ پھر دریافت کیا: اس کے بعد کون زیادہ حق دار ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اس کے بعد تیرا باپ۔

اولیاء اللہ کے بارے میں فرمایا کہ ان سے نسبت بڑی بات ہے۔ فرمایا کہ ایک ولی کا ایک یہودی سے مناظرہ ہوا۔ اسلام کی حقانیت پیش کرنے کیلئے وہ آگ سے گزرے اور نہ ہی یہودی بھی ان کے ساتھ آگ سے محفوظ گزر گیا۔ تو انہوں نے بارگاہ ایزدی میں شکوہ کیا۔ جواب ملا کہ اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں تھا۔ اسے کہو اکیلا آگ میں داخل ہو۔

اولیاءؒ حقہ توحید باری میں مستغرق ہوتے ہیں۔ وہ فنا فی اللہ ہوتے ہیں۔ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس محمود نے وزیر بھیجا۔ آپ نے کوئی توجہ نہ دی۔ وزیر نے محمود سے شکایت کی۔ وہ خود آپ کے پاس حاضر ہوا۔ اور آیت پڑھی۔ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کریم کی اطاعت کرو اور اپنے حکمرانوں کی اطاعت کرو (النساء) آپ نے فرمایا ہمیں ابھی اطیعوا اللہ سے ہی فارغ نہیں ہوئے چہ جائیکہ بات اولی الامر تک جا پہنچے۔ محمود نے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے اپنا کرتہ دیا کہ سومنات میں اپنے ساتھ رکھنا

سومنات فتح نہیں ہو رہا تھا۔ محمود نے آپ کے کرتے کی وساطت سے دعا کی اللہ کریم نے سومنات کو فتح کرا دیا۔ محمود نے آپ کو خواب میں دیکھا۔ آپ کا وصال ہو چکا تھا۔ آپ نے فرمایا محمود تو نے میرے کرتے کی قدر نہ کی۔ محمود نے پوچھا وہ کیسے حضرت؟ فرمایا اگر تم اس کی وساطت سے پورے ہندوستان کو مسلمان بنانے کی دعا کرتے تو رب کریم پورے ہند کو مسلمان بنا دیتا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے پاس ایک بزرگ آئے اور کہا کہ اللہ کے وجود پہ میرے پاس بیشمار دلائل ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ تمہارے راستے میں ایک دیہاتی آئے گا۔ اس سے خدا کے وجود پہ

دلیل مانگنا۔ اور اس کے جواب کو پلے باندھ لینا۔ اس بزرگ کو دیوانی بلا اور اس سے اللہ کے وجود پر دلیل مانگی۔ اس نے کہا کہ بلا دلیل مانتا ہوں۔ اس نے پھر اصرار کیا۔ آخر اس نے انہیں ایک ڈنڈا مارا اور کہا کہ بلا دلیل خدا ایک ہے۔ چنانچہ اس بزرگ کا آخری وقت آپہنچا۔ شیطان سے مناظرہ ہونے لگا۔ اللہ کے وجود پر شیطان کو سو دلائل دیئے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور مزید سوال داغ دیئے۔ حضرت شیخ عبدالقادرؒ نے وضو کے بعد بچا ہوا پانی پھینکا۔ مریدوں نے سبب پوچھا تو فرمایا۔ میں اسے دیہاتی والا جواب یاد کرا رہا تھا۔ چنانچہ اس بزرگ نے شیطان سے پیچھا چھڑایا۔

فرمایا کہ مقدمات کے فیصلے ظاہری گواہوں اور بیانات پر کیا کرو استخارہ یا کشف اس کے لیے حجت نہیں۔ کشف کے بارے میں فرمایا کہ یہ انتہائی مبہم ہوتا ہے۔ اس کی تعبیر و تشریح کے لیے کامل استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کسی قسم کا کشف ہو میرے سامنے پیش کیا کرو۔ جو صرف اپنے کشف پر مگن رہتا ہے اور اس کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا۔ اس کے گمراہ ہونے کے مواقع زیادہ ہیں۔ اس لئے جنہیں یہ نعمت ملے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ مگر اسی بنیاد پر کبھی کوئی فیصلہ نہ کریں۔ جنہیں یہاں کشف نہ ہو تو اس کے پیچھے نہ پڑیں۔ قیامت کی ہولناکیوں کو وہی ذکر ختم کرے گا جس کا صلہ یہاں نہ ملا۔ آخرت میں اعمال کی بہت ضرورت ہوگی۔

کسی ساتھی کے بارے میں فرمایا کہ اس کا کشف بہت تیز تھا۔ وہ اس نعمت کو سنبھال نہ سکا اور جماعت سے ہی خارج ہو گیا۔ اور اللہ اللہ سے محروم ہو گیا۔ شمس الحق صاحب نے پوچھا حضرت میں تو اس معاملے میں اندھا ہوں۔ حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ فرمایا کہ مجھے بھی تقریباً بیس سال تک کوئی کشف وغیرہ نہ تھا۔ لیکن ذکر اگر اس لیے کیا جائے تو پھر بیکار ہے ذکر اللہ کا حکم ہے۔ اور اس کی رضا کے لیے کرنا چاہیئے۔

فرمایا کہ میں نے زندگی کا ایک گرانقدر حصہ مناظروں میں گزارا۔ مگر مناظرے میں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے پھر میں نے یہ راستہ اختیار کیا۔ الحمدللہ، اللہ پاک نے مجھے بہت نوازا۔ میری جائے نماز پر نماز پڑھنے سے اللہ کریم نے میری بیٹی کو کشف سے نواز دیا۔ اور میری والدہ کا انتقال ہوا تو وہ اُن پڑھ تھیں۔ قبر میں دیکھا کہ بڑے اطمینان سے منکر نکیر کے سوالات کا جواب دے رہی ہیں پوچھنے پر انہوں نے فرمایا کہ مجھے ایک غیبی آواز آ رہی تھی اور میں جواب دے رہی تھی۔ قاضی صاحب کے بارے میں فرمایا کہ ان سے ملاقات ہوئی۔ اور انہوں نے میدان رشد و ہدایت میں کسی مرد حق کے نہ ہونے کا شکوہ کیا۔ تب میں نوجوان تھا اور وہ سفید ریش تھے۔ میں نے کہا آپ میرے ساتھ آئیں۔ ان کو طریقہ ذکر سکھایا اور تین دن ایک ولی کی قبر کے پاس ذکر اور مراقبہ کرانے کے بعد ان سے پوچھا کہ بتائیں کچھ نظر آتا ہے۔ تو قاضی صاحب نے کہا جی ہاں ایک بزرگ دستہ بستہ کھڑے ہیں۔

فرمایا کہ ایک دن قاضی صاحب تشریف لائے اور کہا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں ایک آدمی کو سبز لباس میں دیکھا جو کسی جگہ سے نکلنے کی درخواست کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میری وہاں بہت رسوائی ہو رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔ نہیں تم وہیں رہو کوئی نہ کوئی سنبھال لے گا۔ فرمایا کہ مشائخ سے بات ہوئی۔ قاضی صاحب کہنے لگے شاید عرب سے اسلام نکلنا چاہتا ہے۔ فرمایا وہاں سے تو کب کا نکل چکا ہے۔ پاکستان سے نکلنا چاہتا ہے۔ لیکن اجازت نہیں ہوئی۔ اور یہ کہ ابھی قیامت میں کچھ وقت باقی ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں کوئی نہ کوئی سنبھال لے گا۔

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ نے اور بھی باتیں اپنے متعلق فرمائیں۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ حضرت اپنی ستائش فرما رہے ہیں۔ آپ نے فوراً فرمایا کہ مجھ جیسا سیہ کار شاید ہی کوئی ہو۔ میں بہت عاجز ہوں اور آپ نے مسلسل اپنی کسر نفسی کا ذکر فرمایا مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ کریم نے ہم پر احسان فرمایا اور اتنی عظیم ہستی سے ملنے کا موقع عنایت فرمایا جو امید و بیم کا پیکر ہے۔ اور علم و عمل کا دریا، جو بیک وقت بے شمار صفات سے متصف مگر پیکر عجز و نیاز ہے۔ الحمدللہ کہ ایسے دلِ یکتا سے مجھ جیسے سیہ کار کی نسبت قائم ہو گئی۔ ؎

شنیدم کہ در روزِ امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بخشند کریم

اولیاء اللہ کے سلسلوں کے بارے میں فرمایا کہ سب قابل احترام ہیں۔ ایک بزرگ تھے جو مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے۔ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی صحبت حاصل تھی۔ لیکن ایک دفعہ ایک ہفتہ گزر گیا مگر زیارت

نہ ہوئی وہ بڑے روئے۔ ایک ہفتہ بعد دربار نبوی میں حاضری نصیب ہوئی۔ عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟ فرمایا کہ تم نے ابوحنیفہؒ پہ بے ادب جملے کہے یہی بے ادبی مانع فیض ہوئی۔ یاد رکھو درخت ایک ہے اور آگے شاخیں چار ہیں۔

فرمایا برزخ ہماری دنیا سے بہت بڑا ہے۔ وہاں جو لوگ جا رہے ہیں ان کا بہت برا حال ہے۔ سوائے بچوں اور دیوانوں کے جو غیر مکلف ہیں۔ ایک دفعہ ایک ساتھی آیا اس نے اپنے فوت شدہ عزیز کے بارے میں پوچھا۔ توجہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ عذاب میں گرفتار ہے۔ میں نے ان کو کلمہ طیبہ ایک لاکھ بار پڑھنے کی تلقین کی۔ کلمہ پڑھا گیا مگر مرض جوں کا توں رہا۔ معلوم ہوا کہ وہ حقوق العباد میں ماخوذ ہے۔ اس کا چھٹکارا نہیں۔

ذکر کے بارے میں فرمایا کہ ذاکر پر جادو نہیں چل سکتا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیف' من سیوف اللہ کہا تھا۔ اللہ کی طرف نسبت ہو گئی۔ اب کسی کی جرأت کہ اللہ کی تلوار کو توڑ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت خالدؓ زخموں سے چھلنی تھے مگر شہید نہیں ہوئے۔

فرمایا کہ ذاکر کا دل بیدار ہو جاتا ہے اور اسے رب کائنات کے ساتھ ایک خاص نسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ کی یاد دل سے باقی اشیاء کو ذلیل کر کے نکال دیتی ہے۔

شیطان کے بارے میں فرمایا کہ وہ انسان کا ازلی دشمن ہے اور مجھے آج بھی سونے نہیں دیتا۔ لیکن اس سے پریشان نہ ہونا۔ وساوس کا بہترین علاج معوذتین، تیسرا کلمہ اور آیت الکرسی ہے۔ آیت الکرسی میں ولا یؤدہ حفظہما کے کلمات تین بار پڑھیں اور لاحول ولا قوۃ کا ورد کریں۔ شیطان بھاگ جائے گا اور وساوس ختم ہو جائیں گے۔

سالانہ اجتماع

۲۰ جولائی بروز بدھ
کو دارالعرفان منارہ
میں
منعقد ہو رہا ہے اور
۳۰ ستمبر
تک جاری رہے گا۔
اجتماع میں شامل ہونے
والے احباب ۲۰ جولائی
تک دارالعرفان پہنچ جائیں

داخلہ

صقارہ اکادمی

دارالعرفان منارہ

آٹھویں جماعت میں داخلہ کے متمنی طالب علم اپنے سرپرستوں کے ہمراہ ۱۱ مئی ۸۸ء شام تک منارہ تشریف لے آئیں۔ ساتویں پاس کا سرٹیفکیٹ اور تین عدد فوٹو ہمراہ لائیں۔ یاد رہے داخلہ صرف آٹھویں جماعت میں ہو گا اور یہ داخلے کی آخری تاریخ شمار ہو گی۔

پرنسپل

تربیت کا مہینہ

حافظ عبد الرزاق

انسان اس دنیا میں قدم رکھنے کے بعد ہوش سنبھالتے ہی جینے کا ڈھنگ سیکھنا شروع کر دیتا ہے اور یہ عمل اتنا طویل ہے کہ اس دنیا سے رخصت ہونے تک جاری رہتا ہے۔

اس عمل میں تین چیزیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

اول زندگی کا نصاب یا آئیڈیل۔ دوم معلم سوم ماحول ہر انسان اپنی پسند کے مطابق کسی خاص قسم کی زندگی بسر کرنے کو اپنا آئیڈیل بنالیتا ہے۔ اور اسی کے مطابق ایسے آدمیوں کو تلاش کر لیتا ہے جو اسے اس کے مطلوبہ نقشہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طور طریقہ سکھائیں۔ پھر وہ ایسے ماحول کی تلاش شروع کر دیتا ہے جہاں وہ آزادی سے اپنے مطلوبہ نقشہ کے مطابق زندگی گزار سکے اور وہ ماحول اس کے لئے سازگار ثابت ہو شریفانہ اور بہیمانہ دونوں قسم کی زندگیوں میں یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے مثال کے طور پر ایک شخص ڈاکٹر بننا چاہتا ہے اسے یقیناً میڈیکل سائنس سے دلچسپی ہوگی پھر وہ ایسے اساتذہ تلاش کرے گا جو فن طب کے علمی اور عملی دونوں پہلوؤں میں اس کی رہنمائی کر سکیں۔ پھر وہ ایسے ماحول کے لئے میڈیکل کالج میں داخلہ لے گا۔ اس کی علمی اور نجی گفتگوئیں ایسے ہی لوگوں سے ہوں گی جو فن طب کے ساتھ دلچسپی رکھتے ہوں گو دنیا میں اور بھی بے شمار شریفانہ فن اور ان کے جاننے والے موجود ہیں مگر اسے جو لطف اور سکون اپنے فن کے جاننے والوں میں آئے گا وہ کسی اور جگہ نہیں مل سکے گا۔

اسی طرح ایک شخص چور اور ڈاکو بننا پسند کرتا ہے وہ اسی قسم کے ناول تلاش کرے گا۔ ایسی فلمیں دیکھنے کا شوق ہوگا اور اسی قماش کے لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا اٹھنا بیٹھنا پسند کرے گا۔ اور ایسے جرائم پیشہ لوگوں کے ماحول میں وہ نشہ آئے گا جس کا ایک شریف آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر، انجینئر، قانون دان، تاجر صنعت کار بننا اچھی بات ہے۔ اور لوگ اپنی اپنی پسند کے مطابق کسی نہ کسی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح چور، ڈاکو، قاتل، سمگلر وغیرہ بننا بری بات ہے مگر پھر بھی لوگ ان تنگ انسانیت پیشوں میں عمریں کھپا دیتے ہیں۔

اصل ضروری اور بنیادی چیز تو انسان بنتا ہے اور انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سیکھنا ہے مگر بہت کم لوگ اس انداز سے سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسانیت بہت بڑا شرف ہے، بڑی عظمت اور بلندی ہے اور ظاہر ہے کہ بلندیوں تک پہنچنے کے لئے محنت اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور فانی اور وقتی لذتوں کے رسیا محنت سے جی چراتے ہیں اور حیوانیت کی پستیوں کی طرف لڑھکتے چلے جانے میں ہی مگن رہتے ہیں کسی بلند و بالا مکان کی چھت پر چڑھنے کے لئے وقت کوشش اور ہمت درکار ہے۔ اگر چھت سے نیچے آنا اور فوری طور پر آنا مطلوب ہو تو بس منڈیر پر بیٹھ کر جسم ذرا ڈھیلا چھوڑ دو ایک سیکنڈ میں نیچے پہنچ جاؤ گے۔ یہ اور بات ہے کہ جسم کی کوئی ہڈی پسلی نہ بچے یا جان ہی ہوا ہو جائے۔

خالق انسان نے انسان کو انسانوں کی طرح جینے کے لئے نصاب خود بخود تجویز فرمایا ہے، بلکہ تیار فرمایا ہے اور اس نصاب کی تعلیم دینے کے لئے اساتذہ کا انتخاب بھی خود فرمایا ہے۔ پھر ان اساتذہ کرام نے اپنی محنت شاقہ سے انسانوں کو ایسا انسانیت پرور ماحول تیار کر کے دیا جس کی نظیر انسانیت کی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ خالق انسان نے یہ سلسلہ ابتدائے آفرینش سے شروع کر دیا تا آنکہ اس نصاب انسانیت کی آخری کتاب کا آخری معلم مبعوث فرما کر اعلان کر دیا

اس نصاب کا نام

اسلام اور قرآن کا نام قرآن حکیم اور اس آخری معلم کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کے احسان سے انسانیت قیامت تک سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

اسلام نے انسان کی تربیت کے لئے ایک خاص طرز کے مجاہدہ کا نصاب مقرر کیا ہے جس کا اصطلاحی نام عبادات

منصوصہ ہیں۔ ان عبادات میں سال بھر میں رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنا بھی شامل ہے۔

روزہ اور اخلاقی تربیت

اسلام کی ہر عبادت کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے مثلاً نماز میں طہارت، پابندی وقت، اطاعت امیر کے ظاہری آداب کے ساتھ اخلاص، خشوع، خضوع اور توجہ الی اللہ کے اوصاف پیدا کرنے اور حبِ زر، خود غرضی وغیرہ رذائل کا ازالہ کرنے کی مشق ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ تعلق باللہ اس انداز سے پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اپنے کمائے ہوئے مال کا مالک نہیں بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے مال کا امین سمجھنے لگتا ہے لہٰذا اس کے پیش نظر صرف مالک کی رضا ہوتی ہے۔

اسی طرح روزہ کا اپنا ایک خاص مزاج ہے۔ جس کی نشان دہی نبی کریم نے ان الفاظ میں فرمائی کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یعنی روزہ صرف میرے لئے ہے اور اس کا بدلہ میں ہوں میری خوشنودی ہے ہر عبادت کی تہ میں ایک جذبۂ عبودیت ہوتا ہے مگر کوئی خاص ہیئت یا طرز ادا اس عبادت کی مرئی صورت ہوتی ہے جو سر کی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ نماز ہے کہ آدمی وضو کرتا ہے، قیام، رکوع، سجدہ اس عبادت کے مظاہر ہیں دیکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ آدمی نماز پڑھ رہا ہے اسی طرح زکوٰۃ میں لینے والا یہ جان لیتا ہے کہ یہ شخص مالی قربانی کر رہا ہے، حج میں گھر بار چھوڑ کر جانا تو ظاہر باہر ہے اب تو خاص اہتمام سے ہار پہنائے جاتے ہیں، جلوس نکالے جاتے ہیں کہ صاحب حج پر جا رہے ہیں اور حاج سے آ رہے ہیں غرض ہر عبادت کے عمل سے اس خاص عبادت کا ظاہر ہونا ایک قدرتی بات ہے مگر روزہ ایسی عبادت ہے۔ بندے اور رب کے سوا کوئی تیسرا شخص اس سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے روزہ کی خصوصیت یہ ہے کہ آدمی میں یہ جذبہ بیدار کرتا اور اسے ترقی دیتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے، جانتا ہے لہٰذا اس سے معاملہ کھرا رکھنا چاہیئے۔ یہ ایک وصف حقیقت میں انسانیت کی معراج ہے۔ انسان جو کام کرتا ہے اس سے یا وہ اچھا ہوگا یا برا۔ اگر اچھا کام ہو تو آدمی کے دل میں خواہ مخواہ یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ لوگ اس سے آگاہ ہوں اور میری تعریف کریں۔ یہی ریا ہے اور یہی انسان کا عمل صالح کو ضائع کر دیتی ہے۔ اور اگر وہ کام برا ہے تو آدمی یہ احتیاط کرتا ہے کہ کوئی عام شخص یا قانون کا کوئی محافظ دیکھ تو نہیں رہا۔ اگر اسے اطمینان ہو جائے کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا تو وہ کر گزرتا ہے۔ یہی مجرمانہ ذہنیت ہے اور اس کا ضمیر مجرم ہے خواہ وہ بظاہر بڑا پارسا شمار ہوتا ہے۔

روزے کی خاصیت یہ ہے کہ انسان میں یہ عقیدہ پختہ کر دیتا ہے کہ میرے عمل سے میرا رب آگاہ ہے اور اس کا صلہ مجھے وہ دے گا کسی کو بتانے اور دکھانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ پھر روزہ انسان میں یہ عقیدہ پختہ کر دیتا ہے کہ ایک خفیہ پولیس ہر وقت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں اس لئے کیوں نہ بھلے مانسوں کی طرح آدمی بن کر زندگی بسر کی جائے۔ پھر روزہ انسان کو یہ تربیت دیتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی کرنے سے اس کی گرفت سے نہ تو کوئی بچ سکتا ہے، نہ کوئی دوسرا اسے بچا سکتا ہے۔ اس کے برعکس انسانی مواخذہ سے خواہ وہ سوسائٹی کی طرف سے ہو یا قانون اور حکومت کی طرف سے آدمی بچ نکلنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر تلاش کر لیتا ہے۔

روزہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان کی خواہشات پر قابو پانے کا مطالبہ ہے اور قابو پانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اتنی ہمت پیدا کرے کہ کونسی خواہش کس وقت کس حد تک پوری کر لینا معیوب نہیں بلکہ اس کی اجازت ہے۔ انسان کی سب سے زیادہ غالب خواہش غذا اور جنس کی ہے، غذا سے بقائے حیات اور جنس سے بقائے نوع مقصود ہے اگر اس خواہش کو سرے سے مٹا دیا جائے تو حیات اور نوع دونوں کا خاتمہ ہے لہٰذا روزہ اس خواہش پر کنٹرول کرنا سکھاتا ہے کہ ایک خاص وقت کے لئے یعنی طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ضبط کیا جائے۔ اس ضبط کا فائدہ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی خواہشات کے ماتحت نہیں ہوگا بلکہ خواہشات اس کے ماتحت ہوں گی اور وہ اپنی خواہشات کا رخ جس طرف موڑنا چاہے موڑ سکے گا اور خواہشات کا صحیح رخ خود معلم انسانیت ﷺ نے بتا دیا یعنی کمال ایمان یہ ہے کہ آدمی کی خواہشات میری تعلیمات کے تابع ہو جائیں۔

خواہ یوں کہا جائے کہ ان کا مورال بہت بلند تھا۔ مگر یہ مورال ہے کیا چیز اور آیا کہاں سے؟ اسی کا نام اعتماد علی اللہ ہے اور یہ پیدا ہوتا ہے خواہشات پر قابو پا کر شریعت کی پابندیوں کو دل و جان سے قبول کرنے سے۔

پھر یہ دیکھئے کہ اس وقت کی رومی اور ایرانی سلطنت میں آسودگی عیاشی اور خوشحالی کی کوئی کمی تھی؟ مگر چند برسوں میں دنیا کا جغرافیہ بدل کر رکھ دینے والے کیا وہ لوگ تھے جو کہتے کہ روزہ رکھنے سے کمزوری ہو جاتی ہے۔ یا حالات اس کے برعکس تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرستوں کے ہاں زندگی اور قوت کا تصور ہی دوسرا ہے اقبال نے کہا تھا ؎

بمیری گر بہ تن جانے نہ داری
دگر جانے بہ تن داری نہ میری

مراد تو یہ ہے کہ اس جسم کے اندر اگر روحانی قوت مفقود ہے تو آدمی زندہ نہیں بلکہ چلتی پھرتی لاش ہے چنانچہ وہ خود ہی کہتا ہے ؎

وہ چیز اور ہے کہتے ہیں جان پاک جسے
یہ رنگ و نم، یہ لہو، آب و ناں کی ہے بیشی

جان پاک آب و ناں کی بیشی سے نہیں آتی بلکہ اس کے سرچشمہ دوسرا ہے جس کے حصول کے لئے خالق جان پاک نے ایک اصول بنا رکھا ہے۔

یعنی جس نے اس کا تزکیہ کر کے اسے لامکاں کی بلندیوں تک پرواز کرنے کے قابل بنا لیا وہ جیت گیا اور جس نے خواہشات کا غلام بن کر اس مونی کو مٹی میں ملا دیا وہ لٹ گیا۔ لہٰذا یہ روزہ تربیت ہے تزکیہ کی مشق ہے اور حقیقی قوت اسی سے آتی ہے ہاں

؎ فر ہی چیزے دگر آماس چیزے دیگر است

۲۔ امتحان

یہ امتحان کا مہینہ ہے۔ امتحان کے لئے کئی امور قابل غور ہوتے ہیں۔

اول یہ امتحان ان لوگوں کا لیا جاتا ہے جو کسی ادارے میں داخلہ لیں اور اپنے آپ کو امتحان کے لئے پیش کریں۔ اس لئے یہاں وہی مخاطب ہیں جو مدرسہ محمدی میں داخلہ لینے کے مدعی ہوں۔ انہیں خطاب کرتے ہوئے اسی وصف سے یاد کیا گیا

دوم: یہ کہ امتحان کی غرض امتحان دینے والے کا فائدہ اور اس کا مستقبل روشن بنانا مقصود ہوتا ہے ممتحن کا کوئی فائدہ مدنظر نہیں ہوتا۔

یہاں یہی مقصود ہے کہ امتحان تمہارا لیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ تم سے پہلے ایسے مدعیوں کا امتحان لیا جاتا رہا۔

تیسرا یہ کہ امتحان میں کامیابی اور ناکامی کا نتیجہ ہمیشہ ایک جیسا نہیں ہوتا بلکہ لازماً مختلف ہوتا ہے لہٰذا یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے اور واقعی ایسا ہوتا ہے۔

چہارم۔ امتحان میں کامیابی پر کوئی سند، ڈپلوما، ڈگری ملا کرتی ہے جو بالعموم مستقبل کی تعمیر کے لئے ضمانت ہوتی ہے۔ جہاں انسان ہی ممتحن ہوں وہاں یہ ڈگری کوئی یقینی ضمانت نہیں ہوتی اس لئے یہاں تو ڈگریاں ہاتھ میں لئے لوگ کہتے پھرتے ہیں ؎

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند
پاس کر بیٹھے ہیں لیکن نوکری ملتی نہیں

مگر جہاں ممتحن رب العالمین ہو، سند وہ عطا فرمائے اور اس کی ضمانت رحمۃ العالمین دے وہاں بات اتنی یقینی ہے کہ بے اختیار کہنا پڑتا ہے۔

اس کھلی حقیقت کے باوجود حیرت ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ پر اعتماد کیوں نہیں رہا۔ آپ بھی سن کر حیران نہ ہوں بلکہ اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائیں اور آج سے پچاس برس پہلے کے حالات کا نقشہ چشم تصور کے سامنے لا کر مقابلہ کریں۔ پہلے حالت یہ تھی کہ میرے شہر میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ملتا تھا جو سر عام کھانا پینا تو دور کی بات ہے اگر چوری چھپے بھی روزہ کھائے تو یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ کوئی شخص اس کی اس حرکت سے واقف ہے مگر آج سر بازاریوں آزادی سے لوگ کھاتے پیتے ہیں کہ شبہ ہونے لگتا ہے یہ ملک کفرستان ہے۔ اور اس سے بڑھ کر بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ لوگ اس ڈھٹائی پر فخر کرتے ہیں کوئی پوچھے تم نے کونسا قلعہ فتح کیا کہ یوں اکڑ رہے ہیں یہ صورت عدم اعتماد ہی کی نہیں بلکہ اللہ کے مقابلہ میں ڈھٹائی کی انتہا ہے۔

روزہ جو مومن کا امتحان تھا اس کی کیفیت بھی آج کالج اور یونیورسٹی کے امتحانوں کی سی ہو گئی ہے اول تو امتحان

سے جی چرانا، بہانے بنانا، تحریک چلانا احتجاجی ہڑتالیں کرنا ایسا عام ہو گیا ہے کہ ہر طالب علم یہ چاہتا ہے کہ کالج میں نام درج کرلیں سال بھر پوچھیں نہیں اور سال کے اختتام پر سند یا ڈگری عنایت نہ کریں بلکہ ہمارے پیش کر دیں۔ یہی صورت رمضان میں نظر آتی ہے جیسے مسلمانوں کا عام غیر روزہ کے خلاف احتجاجی ہڑتال کے طور پر نکل کھڑا ہوا ہے۔

پھر امتحان میں بیٹھ بھی جائیں تو کالج پر احسان ہے گویا عین احسان چکایا جا رہا ہے اور کتابوں سے نقل کرکے پرچہ لکھنا گویا ان کا پیدائشی حق ہے۔ اور ان ناک کٹوں کی آبادی میں اگر کوئی ان کو انہیں منع کرے تو جواب میں بندوق یا پستول کی زبان سے بات ہوتی ہے یہی حال روزہ کے امتحان کے سلسلے میں ہے کہ اگر کھانے پینے سے منہ بند بھی رکھا ہے تو خواہشات پر کنٹرول کا یہ عالم ہے کہ زبان سے جھوٹ اور غیبت جاری ہے کان سارا دن "فنا" کے نغموں میں مصروف ہیں۔ آنکھیں بے حیائی کے مناظر دیکھنے کے لیے بیتاب ہیں، ہاتھ ملاوٹ، آمیزش، کم تولنے اور ہیرا پھیری کرنے میں مصروف ہیں اور ہر شخص کا دماغ ہر وقت اسی سوچ میں محو ہے کہ کس طرح کسی سے بے ایمانی اور دھوکا کیا جائے (الا ماشاءاللہ) پھر یہ امتحان کاہے کا ہوا۔ بس امتحان کی ایکٹنگ ہوئی، سوانگ بھرا گیا یہ نہ سوچا کہ معاملہ جس سے ہے وہ بڑا باریک بین ہے اور بہت بڑا نقاد ہے۔

۳۔ انعاماتِ الٰہی

کسی حاکم سے یہ توقع نہیں رکھی جاتی کہ جب کوئی حکم دے اس کے ساتھ ہی اس حکم کی تعمیل کے فوائد اور نتائج بھی وضاحت سے بیان کردے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ حکم کی علت پوچھے بغیر اس کی تعمیل کی فکر ہوتی ہے کہ عدم تعمیل کی وجہ سے کہیں دھر نہ لیے جائیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ فوج کا ماٹو یہ ہے "سپاہی کا کام حکم ماننا" سپاہی کو اس سے بحث نہیں کہ حکم کیوں دیا گیا تعمیل اور عدم تعمیل کے فوائد اور نقصانات کیا ہیں بلکہ سپاہی کی کیفیت یوں ہوتی ہے جیسے لبلبی دبائی اور ٹھاہ ہو گئی اسی طرح ادھر حکم ملا ادھر سپاہی تعمیل کے لئے دوڑ پڑا یہ بات صرف فوج سے متعلق نہیں سول میں بھی احکام کی یہی حالت ہوتی ہے آپ سوچیں کبھی کسی نے یہ سوال کیا کہ کورٹ فیس ۵۰/۷ پیسے فی سیکڑہ کیوں مقرر کی گئی ہے، یا کورٹ فیس میں بیع، ہبہ، رہن میں شرح فیس مختلف کیوں ہے۔ بلا تامل حکم کی تعمیل کے بغیر چارہ نہیں۔

اسی طرح رب العالمین کو تو یہ حق پہنچتا ہے کہ جو چاہے حکم دے اور وجہ بتائے بغیر اس کی تعمیل کا مطالبہ کرے اور بندے پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بلا چوں چرا خالق کے حکم کی تعمیل کرے کیونکہ بندہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ پیدائش میں، زندہ رہنے میں، مرنے میں، صحت میں ہر چیز میں اس کا محتاج ہے جو اس کا خالق ہے۔ مگر خالق کی رحمت کا کیا ٹھکانا کہ حکم دیتا ہے اور اپنے بندوں کی دلجوئی کے لیے باشفقت سے حکم کے فوائد بھی بیان فرما دیتا ہے اور یہ معاملہ ہر حکم میں نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی اپنی حاکمانہ شان کا اظہار کرنے کے لئے حکم کی علت بتائے بغیر حکم دے دیتا ہے تاکہ اس کی صفت حکمت اور صفت حکومت دونوں ذہن میں موجود رہیں۔

روزے کا حکم دیتے ہی اس کا فائدہ یا یوں کہیے کہ انعام کا اعلان بھی کر دیا گیا یعنی روزہ رکھو گے تو تمہاری سیرت و کردار اور تمہاری شخصیت میں ایک عظیم انقلاب آجائے گا۔ لاابالی پن ختم ہو جائے گا۔ تم (FREETHINKER) کہلانے میں عار محسوس کرنے لگو گے۔ بہیمانہ بے لگام آزادی کا تصور جاتا رہے گا غیر ذمہ دارانہ رویہ سے تمہیں نفرت ہو جائے گی جہاں کوئی مادی آنکھ تمہیں دیکھ رہی وہاں جرم کرنا تمہارے لئے آگ میں کودنے کے برابر محسوس ہوگا۔ تم ایسے محتاط بن جاؤ گے کہ عملی زندگی میں ہر قدم پھونک کر رکھو گے ان تمام فضائل کے پیدا کرنے اور رذائل سے دور رہنے کے عمل کو ایک اصطلاحی لفظ تقویٰ میں سمو کر رکھ دیا۔ کہ تم روزے رکھو گے تو ہمارے ریکارڈ میں تمہارا نام اہل تقویٰ کی فہرست میں لکھ دیا جائے گا۔ تم دنیا میں متقی یعنی محتاط زندگی بسر کرنے لگو گے تمہارے اندر تقویٰ کا وصف پیدا ہو جائے گا۔ بہت بڑا انعام ہے۔ حیوان اور انسان میں فرق ہی تقویٰ کے وصف سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر تقویٰ کی حقیقت سمجھے بغیر اس سند، اس ڈگری اس انعام کی اہمیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ حضرت عمرؓ

نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا تھا تقویٰ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا امیر المومنین آپ کو کبھی کسی ایسے تنگ راستے سے گذرنے کا اتفاق ہوجس کے دونوں طرف کانٹے دار جھاڑیاں یا کانٹے دار باڑ لگی ہو۔ فرمایا ہاں ایسا اتفاق ہوا ہے۔ عرض کیا پھر آپ کیسے گذرے؟ فرمایا ایسی احتیاط سے کہ جسم سمٹا ہوا ہے کپڑے بدن سے لپیٹ رکھے ہیں کہ نہ تو کپڑے کانٹوں سے الجھیں نہ جسم پر کوئی خراش آئے۔ عرض کیا امیر المومنین یہی طرز زندگی تقویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اعتدال کی راہ جو مقرر فرمائی ہے اس میں افراط و تفریط کی بے قید و سعتیں نہیں پھر اس تنگ راہ کے دونوں طرف نفس اور شیطان، خواہشات اور لذت پرستی کی کانٹے دار جھاڑیوں کا وسیع جنگل ہے۔ تقویٰ یہی ہے اپنے آپ کو ہر خراش اور زخم سے بچا کر مومن زندگی کی راہ پر چلے

زندگی کی راہ میں چل پر ذرا بچ بچ کے چل
یوں سمجھ لے کوئی سینا خانہ بارود ہے

تقویٰ کے وصف کی بہار دیکھنا ہو تو اللہ کی کتاب کھول کے دیکھو، قدم قدم پر تقویٰ کے پھول کھلے ہیں اور ہر پھول کا رنگ جدا اور خوشبو الگ۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقویٰ وہ انعام الٰہی ہے کہ توفیق عمل، اصلاح عمل اور قبول عمل کا مدار تقویٰ پر ہے۔ امید ہے اس انعام کا اندازہ کچھ تو ہو گیا ہوگا اور اس انعام کا وعدہ ان لوگوں کے لئے جو روزے کی تربیت اور امتحان سے دیانتداری اور محنت سے گزریں۔

انعام نمبر ۲: ۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور انعام کا اعلان فرمایا۔

"یعنی جو شخص ایمان اور احتساب کے ساتھ روزے رکھے اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

اس ارشاد میں تین باتیں قابل غور ہیں دو تو روزے کی شرائط ہیں۔ ایک جزا ہے۔ ایمان کی شرط کی وضاحت بڑی تفصیل طلب ہے اس مختصر سے مقالے میں اجمال اور خلاصہ ہی دیا جا سکتا ہے مراد یہ ہے کہ یہ یقین ہو کہ رب اور بندے کا تعلق حاکم اور محکوم ہے۔ بندگی کا یہ تقاضا ہے کہ رب کے ساتھ اطاعت کا تعلق ضابطے کی کارروائی نہ ہو بلکہ قلبی تعلق ہو اور رب کی عظمت کا تعلق و تصور، اپنی عاجزی کا خیال، اس کی قدرت کا خیال اپنی بے بسی کا تصور ہو۔ اس تعلق میں ہیبت، عظمت، محبت، شوق سب عناصر پائے جائیں پھر یہ ہے کہ صرف رضائے الٰہی مقصد ہو کوئی دنیوی مفاد، نام نمود، شہرت صحت وغیرہ پیش نظر نہ ہو۔ یوں سمجھئے کہ اطاعت اس لئے ہو کہ میں اطاعت کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہوں۔ ایسا کرنا گویا مقصد تخلیق کو پورا کرنا ہے۔

احتساب یہ ہے کہ صرف کھانے پینے کے لئے منہ کا پھاٹک بند نہ کیا جائے۔ بلکہ تمام قوتوں اور صلاحیتوں پر کڑی نگاہ رکھی جائے کہ کسی قوت یا صلاحیت پر اتباع خواہشات کی چھاپ نہ لگنے پائے۔ پھر تمام اعضاء و جوارح کے افعال حرکات و سکنات پر نگاہ رکھی جائے کہ جسم کا کوئی عضو خواہش نفسانی کے تحت کوئی حرکت نہ کرنے پائے بلکہ اس اسلحے سے صرف وہی کام اور اسی طرح کام لیا جائے جو اللہ و رسول کو پسند ہو۔ کیونکہ یہ اسلحہ اپنی ملکیت نہیں "سرکاری مال ہے" اپنے پاس تو بطور امانت ہے اور دیکھ لیا جائے کہ سرکاری مال کا ناجائز استعمال قابل دست اندازی پولیس جرم ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ چالان پیشی اس وقت ہوگا۔ جب آنکھیں بند ہوں گی۔ یعنی روزہ صرف پیٹ کا نہ ہو بلکہ دماغ، خیالات، آنکھ۔ کان۔ زبان، ہاتھ، پاؤں اور قوتوں اور صلاحیتوں کا روزہ ہو کہ پوری شخصیت خواہشات کو کنٹرول میں رکھنے میں منہمک ہو۔

تیسری بات کہ اس کے سابقہ گناہ معاف کیے جائیں گے اس میں کونسی کشش ہے؟ یہ حقیقت سامنے رکھیئے کہ آدمی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ سزا سے محفوظ رہے۔ اور سزا ملتی ہی جرم پر، جرم نہ کرے یا ہو جائے اور معافی مل جائے تو لازماً سزا سے بچ جائے گا تو اس مختصر سے جملے سے دو حقیقتیں واضح ہو گئیں۔

اول یہ کہ یہ تو ممکن نہیں کہ انسان سے گناہ سرزد نہ ہو۔ لہٰذا یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ وہ سزا سے بچ سکے۔

دوم یہ کہ اس امر کا امکان ہی نہیں بلکہ ضمانت دی جا رہی ہے کہ جرم اور گناہ معاف کئے جا سکتے ہیں

باقی صفحہ ۴۶ پر ملاحظہ فرمائیں

خطبۂ جمعۃ الاولیٰ

حضرت شیخ المکرم کا رمضان المعظم کے پہلے جمعۃ المبارک کے موقع پر دار لعرفان منارہ میں خطاب ،

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ

عزیزان محترم رمضان المبارک سال بھر کے بارہ مہینوں میں اپنی عظمت کے اعتبار سے اپنے شان کے اعتبار سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بے شمار فضائل ہر رمضان میں آپ سنا کرتے ہیں۔ چونکہ اس کے بیشمار فضائل اللہ کی کتاب میں موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی میں موجود ہیں۔ اس میں مغفرت کے اتنے سامان کئے جاتے ہیں کہ جو شخص رمضان میں بھی اللہ کی مغفرت کو نہ پا سکا حدیث شریف کے مطابق اس جیسا بھی کوئی بدنصیب دنیا میں نہیں ہوگا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ والدین میں سے دونوں زندہ ہوں یا ایک، ماں یا باپ زندہ ہو اور اولاد کو اس کی خدمت کا موقع نصیب ہو اور پھر وہ بیٹا دوزخ میں جائے تو اس جیسا بدنصیب کوئی نہیں ہوگا۔ یا اپنی زندگی میں رمضان المبارک کا مہینہ پائے اور پھر جہنم میں جائے تو اس سے بڑا بدنصیب کوئی نہیں ہوگا۔ لیکن ان سب فضائل سے اور ان سب باتوں سے علیحدہ میں آپ کو ایک نئے انداز سے ایک نئے زاویۂ نگاہ سے رمضان المبارک کے ایک نئے پہلو سے آشنا کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی برکتیں عام ہیں۔ اس کی بخششیں عام ہیں۔ جن کا احاطہ ممکن نہیں ہے اور علماء ہمیشہ بیان کرتے رہتے ہیں۔ آپ حضرات پڑھتے بھی رہتے ہیں خود بیان بھی کرتے اور سنتے بھی رہتے ہیں۔

لیکن رب جلیل نے جس طرف اشارہ فرمایا ہے یہ رمضان المبارک کی بنیادی وجہ ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ:۔ رمضان المبارک کا وہ مہینہ جس میں قرآن حکیم نازل ہوا۔ قرآن حکیم اللہ کا ذاتی کلام ہے۔ غیر مخلوق ہے۔ غیر فانی ہے جس طرح اللہ کی ذات مخلوق نہیں ہے۔ اسی طرح اس کی صفات بھی مخلوق نہیں ہیں۔ اللہ کا کوئی وصف ایسا نہیں ہے جو پہلے کبھی اس کی ذات میں نہیں تھا۔ پھر اس نے بنا کر اپنے ساتھ لگا لیا ہو! جیسے اس کی ذات قدیم ہے۔ ویسے اس کی ساری صفات بھی قدیم ہیں، ازلی و ابدی ہیں اور کلام، اوصاف میں سے ایک بہت بڑا وصف ہے۔ قرآن حکیم اللہ کا ذاتی کلام ہے۔

قرآن حکیم نازل تو ہوا تیئیس برسوں میں۔ اور یہاں ارشاد فرمایا گیا شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ۔ کہ رمضان المبارک کے مبارک مہینے میں۔ پھر اس کی تفسیر و تشریح میں بات یہاں تک پہنچی ہے کہ لیلۃ القدر کی ایک رات میں۔ تو یہ نزول تھا ذات باری سے اس مقام تک جہاں سے فرشتہ وصول کرتا ہے۔ یہ جرأت فرشتے میں نہیں ہے کہ اللہ کلام فرمائے اور فرشتہ براہ راست سن لے۔ اللہ کی ذاتی تجلی ہو۔ اور فرشتہ اسے دیکھ لے اللہ کا ذاتی کلام ہو اور فرشتہ سن سکے، برداشت کر سکے یہ ممکن نہیں ہے۔

اس لیے رب جلیل نے اس مبارک مہینے میں اپنے اس مبارک کلام کو، اپنی ذات سے ایک ایسے مقام سے نازل فرما

دیا جہاں سے جتنا وہ چاہتا تھا اتنا جبرائیل امین حاصل کر لیتے تھے اور جو جبرائیل امین حاصل کرتے تھے وہ فوراً آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالی میں پہنچا دیتے تھے اس طرح اس مقام سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے میں تیئیس برس صرف ہوئے۔ ذات باری سے اس مقام تک پہنچنے میں وقت کی ایک بہت تھوڑی مقدار، وہ لمحہ رمضان المبارک میں تھا۔

آج کل تو سائنس نے بہت سارے مسائل حل کر دیئے ہیں یہ وڈیو اور ٹیلی ویژن ہیں ان میں بھی کچھ سسٹم ہوتا ہے۔ سنگل لائن سسٹم، ڈبل لائن سسٹم، تھری لائن سسٹم وغیرہ۔ ہمارے ہاں جو سسٹم چلتا ہے یہ عموماً دو لائنوں کا ہے۔ کیمرے سے لے کر وڈیو، وی۔ سی۔ آر۔ اور ٹیلی ویژن تک سارے تین لائنوں کے ہوتے ہیں امریکہ میں ہمارے ہاں ٹی وی سیٹ پہ دس یا بارہ چینل ہیں وہاں میرے خیال میں کم از کم ایک سو بیس چینل ہوتے ہیں۔ وہاں سے جو کیسٹ لائی جائے اُسے دو لائن کے وی۔ سی۔ آر پہ لگا دیں تو وہ دیکھ نہیں سکتے۔ کیسٹ چل رہی ہے ٹی وی آن ہے۔ وی سی۔ آر آن ہے لیکن تصویر نہیں ہے۔ وی سی۔ آر تین لائن کا ہے ٹیلی ویژن دو لائن کا ہے یا ٹیلی ویژن تین لائن کا ہے وی۔ سی۔ آر دو لائن کا ہے۔ کوئی ان دو میں سے ایک میں کمی ہے پھر بھی وہ کیسٹ چل رہی ہے لیکن دیکھ نہیں سکتے کلام الٰہی کا بھی یہی حال ہے۔

کلام الٰہی کو سننے کے لیے بھی تقدس کی وہ عظمت چاہیئے جو کلام الٰہی میں موجود ہے۔ ورنہ کوئی نہیں سن سکتا۔ اسلئے جس کے متعلق یہ اقرار کر لیں کہ اللہ کی طرف سے اس پہ وحی آتی ہے تو اس کے نبی ہونے کا اقرار کر لیا۔ اسے نبی نہ کہیں۔ اسے معصوم عن الخطا نہ کہیں، لیکن جب اقرار کیا کہ فلاں شخص پہ اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے تو اسکی نبوت کا بھی اقرار کر لیا۔ اس کے معصوم ہونے کا بھی اقرار کر لیا کیونکہ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو۔ لیکن اتنا مقدس انسان ہو کہ اس میں خطا کا مادہ پایا جانا ممکن ہی نہ ہو۔ ایک آدمی ساری زندگی گناہ نہیں کرتا وہ نیک، بہت اعلیٰ، بہت قیمتی انسان ہے۔

> اُم المومنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم کو جب دو باتوں میں سے ایک کے انتخاب کا اختیار دیا جاتا تو آپؐ آسان بات کا انتخاب فرمایا کرتے بشرطیکہ وہ بات گناہ نہ ہو۔ اگر وہ آسان بات گناہ ہو تو پھر آپؐ اس سے سب لوگوں سے زیادہ دور رہنے والے ہوتے تھے اور نبی کریمؐ نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہاں! مگر اس وقت ضرور انتقام لیتے تھے جب اللہ تعالیٰ کے احکام کا احترام معرض خطر میں ہوتا۔

دوسرا شخص مسجد میں پیدا ہوتا ہے قَالَ اللّٰہِ وَقَالَ الرَّسُوْلُ پڑھتا ہے۔ حلال کھاتا ہے سچ بولتا ہے نیکی کرتا ہے۔ کوئی گناہ نہیں کرتا۔ مسجد میں مر جاتا ہے۔ مسجد میں دفن ہو جاتا ہے۔ ان کو معصوم نہیں کہہ سکتے، محفوظ ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کہ اللہ نے گناہ سے ان کی حفاظت فرمائی۔ لیکن معصوم نہیں معصوم کہنے کے لیے وہ تقدس چاہیئے کہ اس میں گناہ کرنے کا مادہ سرے سے ہی نہ ہو۔ وہ زندہ انسان ہو۔ کھاتا ہو۔ پیتا ہو، جاگتا ہو زخمی بھی ہو سکتا ہو۔ لڑ بھی سکتا ہو، شادی بھی کر سکتا ہو۔ اس کی اولاد بھی ہوتی ہو۔ پوری انسانی زندگی میں حصہ لینے کے باوجود اس کے وجود اقدس میں گناہ کرنے کا رائی برابر کوئی داعیہ موجود نہ ہو۔ بھرپور انسانی زندگی گزارنے کی استعداد رکھتا ہو۔ اور بھرپور انسانی زندگی گزارنے کے باوجود اتنا مقدس ہو، اتنا مطہر ہو، اتنا صاف ہو، اتنا پاکیزہ ہو کہ اس کے ساتھ گناہ کا تصور ممکن نہ ہو اسے معصوم کہتے ہیں۔ یہ تقدس اس میں یہ استعداد پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کے کلام کو سنتا ہے اگر معصوم نہ ہو تو چاہے جتنا نیک ہو اللہ کے کلام کو سن نہیں سکتا۔ نبوت کے بعد سب سے اعلیٰ درجہ صحابیت کا ہے اور صحابہ میں ایک ایک ہستی ایسی ہے جس کی نظیر تاریخ انسانی کسی اور امت میں پیش نہیں کر سکتی۔

سیدہ عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا ام المومنین میں وہ واحد ہستی ہیں جو فرماتی ہیں کہ مجھے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ حضور

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے بستر میں ہوتے تب بھی آپ پر وحی نازل ہوتی تھی۔ یاد رہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی گھر میں دو بستر نہیں تھے۔ حضورؐ جس گھر میں بھی آرام فرما ہوتے جو زوجہ محترمہ بھی ہوتی ان کے اور حضورؐ کیلئے وہی ایک بستر ہوتا تھا۔ گرمیوں میں وہی کپڑا دوہرا کر کے نیچے بچھا لیا جاتا تھا۔ سردیوں میں آدھا نیچے اور آدھا اوپر کر لیا جاتا۔ کہیں ایک کمبل تھا اور کہیں کھجور کے پتے ڈال کر ایک گدا نما چیز بنا لی گئی تھی یہ تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر تشریف فرما ہوتے ام المومنین رضوان اللہ اجمعین میں سے کسی کے ساتھ آرام فرما ہوتے تو وحی نازل نہیں ہوتی تھی۔ لیکن سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ خصوصیت ہے۔ آپ نے اپنی بہت سی خصوصیتیں گنوائی ہیں جو واقعی بے مثال ہیں۔ یہ بھی بڑی بے مثال بات ہے کہ ان کے بستر میں وحی نازل ہوتی تھی۔ لیکن یہ بھی بڑی پکی بات ہے کہ وحی سننے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا کو سنائی نہیں دیتی تھی۔ پوری امت کی ماں تھیں۔ محبوبہ محبوب کبریا تھیں۔ ان کی نیکی اور برکات کی شہادت اللہ نے دی۔ قرآن میں نازل فرمایا۔ قیامت تک حافظ جا نماز پہ کھڑے ہو کر پڑھتے رہیں گے۔ اس کے باوجود کلام الٰہی کو سننے کے لیے وہ جسے آپ فرشتہ نیسی کہہ لیں، لائن کہہ لیں۔ ذریعہ کہہ لیں، تقدس کی وہ فرشتہ نیسی چاہیئے جو اس فرشتہ نیسی کے ساتھ کوآرڈینیٹ کرے۔ جس فرشتہ نیسی پہ نشر ہو رہی ہے تو کلام الٰہی کا جو تقدس ہے اُسے صرف اور صرف وہ دل سنتا ہے جو معصوم ہو اور وہ نبی ہوتا ہے۔ اسی لیے بعض فرقوں نے انبیاء کے علاوہ آئمہ کے معصوم ہونے کا اعلان کیا ہے۔ یہ مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے۔ دھوکہ ہے کہ نبی نام رکھنے سے مسلمان بک جائیں گے۔ نام امام رکھ دو، اوصاف وہ رکھو جو نبی کے ہوتے ہیں۔ مانا تو اوصاف سے جائے گا۔

جو بات میں عرض کرنا چاہتا تھا اس کی باری اب آئی ہے کہ اللہ کا تقدس، اس کی ذات بے مثل، بے مثال ہے۔ اس کے کلام کا تقدس اپنا ہے۔ اس کے نبی کا تقدس اپنا ہے بے مثال ہے۔ مخلوق میں مخلوق ہونے کے باوجود بے مثال ہے کتنی عجیب بات ہے کہ مخلوق ہو اور اس کی نظیر نہ ہو۔ یہ صرف اور صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شان ہے کہ اللہ نے آپ کی نظیر، آپ کی مثال پیدا نہیں فرمائی۔ اس کے بعد باری آتی ہے انسانیت کی۔ انسانوں کی، جن کے لیے یہ پیغام نازل ہوا۔ اب وہ فرشتہ نیسی تو نہ رہی، وہ بلندی نہ رہی۔ جسے سننے کے لیے نبوت کا تقدس چاہیئے تھا۔ لیکن نبی کی زبان سے نکلے گا۔ نبی ارشاد فرمائے گا۔ تو ایک درجے کا تقدس پھر بھی اس میں ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود ہر کوئی اس سے متاثر نہیں ہو گا۔ لیکن وہی کلام جو اللہ سے اللہ کے رسول نے وصول فرمایا ہے جب اللہ کا رسول آگے بندوں کو پہنچائے گا۔ تو ان بندوں میں اس کلام کو سننے، سمجھنے اور حاصل کرنے کیلئے پھر ایک تقدس کی ضرورت ہو گی۔ وہ تقدس نہ سہی جو نبی کو چاہیئے لیکن اس تقدس کی ضرورت ضرور ہے۔ جو کم از کم نبی کا ارشاد سننے کی اہلیت پیدا کرے۔ مخلوق میں یہ تقدس پیدا کرنے کے لیے اللہ نے رمضان پیدا کر دیا۔

مخلوق میں تقدس پیدا ہوتا ہے اللہ کی اطاعت سے اور اطاعت کا حکم دیا جائے کہ حلال اختیار کرو اور حرام سے رک جاؤ۔ صرف نماز، روزہ اطاعت نہیں ہے صرف سجدے کرنا اطاعت نہیں ہے۔ صرف حج کرنا اطاعت نہیں ہے۔ میں سال میں چار مرتبہ حرم پاک سے ہو آتا ہوں مجھ میں فرق پڑتا ہے۔ جیسا جاتا ہوں ویسا ہی آ جاتا ہوں۔ کسی نے میرا قد بڑھا ہوا دیکھا۔ اگر کسی پہ اللہ کا کرم ہو تو اسکے اندر کچھ تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ جو باہر سے نظر آتی ہیں۔ اس کا کردار بدل جاتا ہے۔ اس کا طریقہ بدل جاتا ہے۔ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس سے دین پھیلتا ہے۔ اس سے نیکی پھیلتی ہے۔ اس سے برائی مٹتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی کا فیض ہے۔ کسی کا کرم ہے کہیں سے کچھ لایا ہے جو بانٹ رہا ہے۔

انسان کا تقدس یہ ہے کہ وہ حلال کو اختیار کرے۔ حرام سے رک جائے۔ جہاں سے اللہ نے منع کیا ہے اُسے چھوڑ دے، جہاں اجازت دی ہے اسے اختیار کرے۔ ہم نے مذہب کو بڑی آسانی سے مسجد تک محدود کر دیا کہ

آگئے وضو کیا، نماز پڑھی، دعا مانگی اور چلے گئے۔ بازار میں جانا ہماری ذاتی زندگی ہے۔ وہاں ہم نے جھوٹ بول لیا۔ چیز مہنگی بیچ لی۔ کسی کی جیب کاٹ لی۔ دھوکا دے دیا۔ سب کچھ کرنے کے بعد اگلی اذان سنی، نماز کے لیے آگئے۔ یوں ہم مذہب کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے، یہ بھی مت سمجھئے کہ جو شخص بازار میں جھوٹ بولتا ہے میں اسے نماز پڑھنے سے روک رہا ہوں۔ کم از کم نماز تو پڑھتا ہے۔ اتنی دیر تو نیکی کرتا ہے۔ نماز نہ چھوڑے، جھوٹ بولنا چھوڑ دے۔ چھوڑنے کا کام وہ ہے جو غلط ہے۔ غلطی کرتا ہے تو اس سے شرمندہ ہو کر نیکی نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ بلکہ غلطی کو چھوڑنا چاہیئے۔ نماز پڑھیں تو نہایت سکون سے پڑھیں۔ چوبیس گھنٹوں میں پانچ نمازوں پہ آدھا گھنٹہ نہ سہی۔ پونا گھنٹہ نہ سہی، ایک گھنٹہ لگا لیں، ایک گھنٹے کے لیے ہم مسلمان ہو جاتے ہیں۔ اور باقی تیئس گھنٹوں کے لیے؟ باقی تیئس گھنٹے بھی تو مسلمان ہونا چاہیئے وہ گھنٹے جو گھر میں گزرتے ہیں۔ جو اولاد کے ساتھ گزرتے ہیں۔ جو والدین کے ساتھ گزرتے ہیں۔ جو دوستوں کے ساتھ گزرتے، جو کاروباری معاملات میں گزرتے ہیں۔ جو بازار میں گزرتے ہیں جو راستے میں کسی کے ساتھ ہمسفر ہو جاتے ہیں تو یہ جتنے معاملات ہیں اخلاقیات ہیں، نظریات ہیں عقائد ہیں۔ تعلقات ہیں۔ ان سب میں اسلام آجائے گا تب ہم اس میں کسی درجہ پہ پہنچیں گے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں کوئی مٹھاس سنائی دے۔ اگر یہ چیزیں نہیں آئیں گی تو نہ خدا کی آواز میں لذت ہو گی۔ نہ حضورؐ کی آواز میں شیرینی صرف شور سنائی دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیرینی تو وہاں موجود ہے۔ اگر آپ کا ریسیونگ سیٹ خراب ہو گا اس کی ریسپشن ٹھیک نہیں ہو گی۔ تو صرف شور ہو گا۔ اس میں کوئی لذت نہیں ہو گی۔

اس ریسپشن کو صحیح کرنے کے لیے اللہ کریم نے یہ احسان فرمایا کہا "میں تجھے اور قریب کرتا ہوں میں تمہاری مشکلیں آسان کرتا ہوں یہ شیطان تجھے بہت تنگ کرتا ہے رمضان کا چاند طلوع ہونے سے لے کر اگلے چاند تک پورا مہینہ چھوٹے بڑے تمام شیطانوں کو قید کر دوں گا۔ اور یہ طے شدہ بات ہے کہ رمضان المبارک میں چھوٹے سے لے کر بڑے سے بڑے ابلیس تک تمام شیطان قید ہوتے ہیں۔

پھر یہ شیطانی کام کیوں ہوتے ہیں بعض انسانوں نے اپنے آپ کو شیطان کے درجے پر پہنچا دیا ہوتا ہے انہیں قید نہیں کیا جاتا کیونکہ خدا کا وعدہ شیطانوں کو قید کرنے کا ہے جو ابلیس کی اولاد میں سے ہیں جو نسل انسانی میں سے ہیں۔ برائی کرتے کرتے شیطان کے ساتھ اتنی نسبت پیدا کر لی ہے کہ اُسے رمضان کا بھی احترام نہیں۔ اللہ کے حکم کا بھی احترام نہیں۔ نیکی اُس کے مزاج ہی میں نہیں، خود برائی کرتا ہے۔ دوسروں سے بھی کرواتا ہے اس کا معنی ہے کہ وہ خود شیطان ہے شیطان کا اُسے بہکانے میں اُس وقت کوئی ہاتھ نہیں۔ کم از کم رمضان کا مہینہ تو وہ بندھا ہوا ہے ایک سہولت تو یہ ہو گئی کہ شیطان بندھ گیا۔

دوسری سہولت یہ دے دی فرمایا: جو نیکی کرو گے اس کا کم از کم ثواب جو دوں گا وہ ستر گنا ہو گا یعنی تم ایک رکعت پڑھو، میں ستر کا ثواب دوں گا تم نفل پڑھو میں فرائض کا ثواب دوں گا شیاطین کو قید کر دیا عبادات کے درجے کو بڑھا دیا۔ اور ساتھ ہی حلال چیزوں سے بھی مخصوص وقت میں روک دیا۔ یعنی اتنے قریب کر لیا اپنے، کہ حلال کی اجازت تھی حرام منع تھا لیکن اب اللہ کا اتنا قرب نصیب ہوا کہ اگر اُدھر دیکھنا بھی ہے تو اُس کے روبرو کھڑے ہو، پانی کا گھونٹ پینا ہے تو پوچھ کر کیونکہ روبرو کھڑے ہو۔ ایک آدمی پس دیوار بیٹھا ہے اُسے بتا دیا جاتا ہے کہ یہ پانی پینے کے لیے ہے، یہ باتھ روم ہے استعمال کے لیے، ایک آدمی امیر کے دربار میں کھڑا ہو بھوکا ہو یا پیاسا، بھاگ کر نہیں جائے گا اپنی مرضی سے کچھ اُٹھا کر نہیں کھائے گا۔ اپنی مرضی سے پیئے گا نہیں۔ اللہ نے مسلمان کو اپنے اتنا قریب کر لیا کہ پانی کا ایک گھونٹ بھی پینا ہو تو مجھ سے پوچھ کر کب پینا ہے، کب نہیں پینا۔ طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک میں ہوں اور تم ہو۔

یہ کئی سال پہلے کی بات ہے سخت دھوپ اور گرمی تھی۔ وہاں سڑک کے کنارے ایک جوہڑ ہے اُس میں پانی تھا۔ ایک شخص اُس طرف بھیڑیں لا رہا تھا میں بھی اُسے دیکھنے کے لیے رک گیا۔ بچارے جانور پیاس کے مارے پانی پر ٹوٹ پڑے۔

لیکن اُس آدمی نے اطمینان سے ہاتھ منہ دھویا وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا کس نے روکا اُسے پینے سے، ایک عام آدمی کو اتنا قریب کر لیا کہ اُسے وہ تقدس نصیب ہو جائے کہ وہ میرے نبی کی بات کو سمجھ سکے۔

نجات کو چھوڑیے، ثواب کو چھوڑیے، بعد کی باتیں ہیں اگر رمضان کا یہ تقدس نصیب نہیں ہو گا تو (خدانخواستہ) ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سمجھ ہی میں نہیں آئے گی۔ عمل کی باری تب آئے گی جب ہم سمجھیں گے ہم میں سمجھنے کی استعداد پیدا ہو۔ کہ اس بات میں لطف کیا ہے! اُس میں شیرینی کیا ہے اُس میں لذت کیا ہے۔ اسے کیوں مانا جائے۔

لوگوں نے غرض کا نام محبت رکھ لیا ہے چونکہ انسان کی ایک دوسرے کے ساتھ اغراض وابستہ ہوتی ہیں انسان کا مزاج ہی ایسا ہے کہ اس کا گزارا مل جل کر ہوتا ہے ایک دوسرے پر زندگی کا مدار ہے کمانے کا، کھانے کا، رہنے کا، یہ اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اسے مدنی الطبع کہا گیا ہے۔ یہ مل جل کر رہنے پر مجبور ہے ایک دوسرے کے ساتھ جو اغراض وابستہ ہوتی ہیں انہیں ہم محبت کا نام دے دیتے ہیں یہ محبت نہیں ہوتی غرض ہوتی ہے جب وہ فائدہ درمیان سے نکل جاتا ہے پھر وہ محبت نہیں رہتی۔

امیر آدمی سے محبت کرنے والے لاکھوں ہوتے ہیں وہ فقیر ہو جاتا ہے تو محبت کرنے والے غائب ہو جاتے ہیں ایک آدمی صحت مند ہوتا ہے محبت کرنے والے لاکھوں، بیمار ہو جاتا ہے محبت کرنے والے نہیں ملتے۔ لوگوں میں بعض خصوصیات ہوتی ہیں دوسرے اُس کے محتاج ہوتے ہیں اُنہیں غرض ہوتی ہے اس کا نام ہم محبت رکھ دیتے ہیں، محبت یہ نہیں ہوتی، محبت وہ جذبہ ہے جو وجہ نہیں پوچھتا، وجہ جانتا ہی نہیں، سنتا ماننا ہی جانتا ہے بس فَاِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

"جو محبت کرتا ہے وہ محبوب کا مطیع ہو جاتا ہے"

محبوب نے کیوں حکم دیا؟ اس میں کس کی بہتری ہے؟ وہ یہ نہیں سوچتا کہ اُس کا کام مشکل ہے یا آسان، وہ پروا نہیں کرتا۔ سننا اور اُس پر عمل کرنا اسے محبت کہتے ہیں محبت خدا سے کی جا سکتی ہے کہ خدا کو کسی سے غرض نہیں ہے وہ محبت کرتا ہے تو بغیر غرض کے کرتا ہے کہ وہ خود بانٹتا ہے۔ اُس کی محبت بے غرض ہوتی ہے، یا پھر اللہ کے رسول سے محبت ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ ہستی ہیں جو سوائے اللہ کے کسی دوسرے کے محتاج نہیں۔ جنہیں نہ ہم سے غرض ہے نہ پہلوں سے، نہ پچھلوں سے، کسی سے کچھ نہیں لینا، دینا ہی دینا ہے، جسے بلاتے ہیں اُسے بھی دینے کے لیے، جسے پیار کرتے ہیں اُسے بھی دینے کے لیے، جس سے شفقت کرتے ہیں اُسے بھی دینے کے لیے۔ اور کسی کو جھڑکتے ہیں تو بھی کچھ دینے کے لیے۔

محبت کرنے کے لیے بھی ایک تقدس چاہیے۔ کیونکہ محبوب کی آواز کے علاوہ دوسری آواز میں لذت نہیں ہوتی، شیرینی نہیں ہوتی۔

مجنوں کا نام امراؤ القیس تھا اچھا خاصا رئیس آدمی تھا کھاتے پیتے گھر کا آدمی تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور یہ دونوں کلاس فیلو تھے ایک استاد کے پاس ہم مکتب تھے پڑھتے رہے۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صلح کر لی اور امتِ مسلمہ ایک بڑے ٹکراؤ سے بچ گئی فارغ ہو کر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے حج پر جا رہے تھے قیس بچپن کا دوست تھا اسے بھی ساتھ لے لیا دونوں اپنے اپنے ناقے پر سوار باتیں کرتے جا رہے ہیں حضرت نے پوچھا یہ بتاؤ کہ اللہ نے مجھے کتنی بڑی نیکی کی توفیق دی اور میں نے کتنا بڑا کام کیا ہے کہ میں نے خلافت چچا کو دے دی، وہ میرا چچا ہے اُس میں کام کرنے کی اہلیت ہے لوگوں کو سنبھال لے گا دین کی خدمت کرے گا۔ اسلامی سلطنت کو وسعت بھی دے گا۔ انشاء اللہ دیکھنا کام بھی اچھا ہو گا۔ میرا فیصلہ غلط نہیں ہو گا۔ تو وہ سنتا رہا اور کہنے لگا "حسن بیچ پوچھتے ہو خلافت نہ مجھے زیب دیتی ہے نہ معاویہ کو" آپ بڑے حیران ہوئے کہ یہ اسے کیا ہو گیا ہے اس کا دماغ خراب ہے تیسرا تو کوئی مدعی نہیں ہے کسی نے خلافت کی بات ہی نہیں کی۔ کوئی آدمی میدان میں نہیں ہے یہ تیسرا کہاں سے لے آیا۔ آپ نے پوچھا پھر کیسے سمجھتی ہے کہنے لگا سمجھتی تو لیلیٰ کو ہے آپ نے فرمایا اُنت مجنون۔ کہ تو پاگل ہے تو اُس غریب کا نام ہی مجنوں پڑ گیا۔

محبت تو یہ ہے کہ اُسے پوری دنیائے اسلام کے نفع و

نقصان سے کوئی غرض نہیں اُسے نہ حسنؓ کے کردار سے کوئی غرض ہے، نہ امیر معاویہؓ کی جرأت مندی کی کوئی ضرورت ہے، نہ اُسے کسی کی فتح کی فکر ہے، نہ کسی کی شکست کی۔ اُسے ایک بات کی فکر ہے کہ بس لیلیٰ اُس کے دل اور دماغ میں سما گئی ہے جدھر دیکھو وہ بات لیلیٰ ہی کی کرتا ہے۔

باپ پکڑ کر لے گیا۔ بیت اللہ شریف کے پردے کو پکڑ کر دُعا مانگی کہ اللہ میرے بیٹے کو شفا عطا کر دے۔ تو کہنے لگا۔ "خدایا عشقِ لیلیٰ کے سوا سب بیماریاں ہٹا دے۔ خدایا لیلیٰ کی محبت نہ لے لینا باقی جو کچھ ہے تیرا ہے تو لے لے"، لیلیٰ میں کچھ ہو نہ ہو، اُس کی رنگت سفید ہو یا سیاہ ہو، اُس کی آواز میں سُر ہو یا نہ ہو، لیکن اُس قیس کے لیے وہ بڑی سریلی تھی اُسے وہ سارے جہاں سے اچھی لگتی تھی کیوں؟ اُسے اُس سے محبت تھی

یہ جو حضورؐ کے ارشادات ہیں، اللہ کے فرمودات ہیں ان کے لیے بھی۔

تقدس کا وہ والیم چاہیئے جس والیم پر جا کر دل کو حضورؐ کے دل سے آشنائی کرنے کی جرأت ہو جائے۔ ویسے تو نہیں ہوتی کوئی تو درجہ بندی ہوگی کچھ تو کرنا ہوگا ہمیں۔ اللہ نے اُس کے لیے شیاطین قید کر دیئے، عبادات پہ اجر بڑھا دیا اور فرمایا: میں اتنا اجر دوں گا۔ بلکہ عجیب بات فرمائی۔ فرمایا: سب عبادتوں کا اجر مقرر ہے لیکن روزے کا تو میں خود ہوں۔ رب جلیل فرماتے ہیں: میں خود روزے کا بدلہ ہوں میں خود روزے کا اجر ہوں۔

تو ذرا اِس زاویہ نگاہ سے رمضان المبارک کو دیکھے گا کہ ہمیں اس پیوریفیکیشن (PURIFICATION) کے لیے اپنا ریسیونگ سیٹ یا جو کمپیوٹر ہمارے اندر لگا ہوا ہے۔ اس کی صفائی کے لیے، اُس کو اس درجے تک لے جانے کے لیے۔ کہ اُسے رسول اللہ کی باتوں میں لذت آئے کہ وہ وجہ پوچھے بغیر انہیں ماننے پر مجبور ہو جائے۔ پھر تو ہم نے رمضان پا لیا اور اگر محض باتیں بناتے رہے اور جیسے تھے ویسے رہے تو ہم نے اس کا مقصد کھو دیا، بخشش کو چھوڑ دیا۔ وہ کہتا ہے:۔ میں کافر کو نہیں بخشوں گا۔ منہیں بخشے گا نہ بخشے یہ اُس کا اپنا فیصلہ ہے لیکن اگر وہ بخش دے تو میں اور آپ روک لیں گے؟ یہی دُعا سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی۔

"اگر تو انہیں رسوا ہی کرنا چاہتا ہے تو تیرے ہی بندے ہیں

> حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمؐ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور آپؐ کی سخاوت کا مظاہرہ سب سے زیادہ ماہِ رمضان میں ہوتا تھا۔ جب حضرت جبریلؑ آپؐ کے پاس آتے تھے، اور حضرت جبریلؑ ہر رات آپؐ کے پاس آیا کرتے تھے اور آپؐ اُن کے ساتھ قرآن کا دور کیا کرتے تھے حقیقت یہ ہے کہ نبی کریمؐ داد و دہش میں چلتی ہوا سے بھی زیادہ سخی تھے۔

ہمارا کیا ہے اگر انہیں عذاب کرنا چاہتا ہے تو کر، رسوا کرنا چاہتا ہے تو کر دے، جلانا چاہتا ہے تو ڈال دے دوزخ میں تیرے ہیں ہمارے نہیں"۔

"اور اگر بخشش بھی دے تو تیری رحمتوں کی بھی کوئی حد نہیں تیری بخشش کی بات نہیں ہے پتہ نہیں وہ کسی ایک بات پہ بخشش دیتا ہے۔

حضورؐ فرماتے ہیں بنی اسرائیل میں ایک بدکار عورت تھی کہیں جا رہی تھی اُس نے دیکھا ایک چھوٹا سا کنواں ہے پاس ہی ایک کتا پیاسا مر رہا ہے، پیاس سے تڑپ رہا ہے اُس نے دوپٹہ پھاڑ کے رسی بنائی اپنی جوتی اُس کے ساتھ باندھ کر دو دو گھونٹ پانی نکال کر کتے کے منہ میں ڈالتی رہی کتا بچ گیا۔ تو وہ فرماتے ہیں (بخاری شریف میں موجود ہے) اللہ نے سارے گناہ معاف کر دیئے۔ فرمایا:۔ چل تجھے اس کے عوض جنت بھیجتا ہوں، کتا بچانے کے عوض اُس کی بخشش تو اتنی ہے نہ تم ماپ سکتے ہو نہ ہم ماپ سکتے ہیں بخش تو دے گا یقیناً۔ وہ کریم ہے۔ بات تو یہ کرو کہ اُس نے ہمارے لئے نعمتیں کیا بنائی ہیں۔ اور ہم اُن میں سے لے کیا سکے۔ لذتیں بکھیریں ہیں اور ہمارے پاس ہے کیا۔ لطف کتنے بانٹ دیئے ہیں اس فضا میں۔ اِس میں کتنی تجلیات ہیں، کتنے انوارات ہیں کتنی برکات ہیں۔ اُن میں سے ہم نے کیا سمیٹا، کیا حاصل کیا تجلیاتِ باری تعالیٰ، انوارات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات دن سمندر کی لہروں کی طرح چلتے ہیں۔ اُن میں

ہم نے اپنے دامنِ دل میں کیا بھرا ؟۔ دیکھنا تو یہ ہے رمضان کا ایک پہلو یہ بھی ہے جس کی طرف اِس آیت کے ضمن میں میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا تھا کہ اسے نِرا اُن بخشش کے وعدوں سے ہی نہ دیکھیے ۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان میں اوصاف ملکوتی پیدا ہو جائیں ۔ فرشتوں جیسے اوصاف ، نہ کھانا ، نہ پینا نہ سونا ، یہ فرشتوں کے اوصاف ہیں انسان میں بھی فرشتوں جیسے اوصاف پیدا ہو جائیں اور وہ اپنے آپ کو اللہ کے روبرو محسوس کرے ۔ رات دن ایسی حضوری نصیب ہو ، ایک امیر آدمی کمرے میں بیٹھا ہے ۔ اندر فریج پڑا ہے پانی ہے ، ٹھنڈا ہے پیاس لگی ہے کیوں نہیں پیتا ؟ سمجھتا ہے یہ میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے ۔ اُسے ایک درجہ حضوری کا حاصل ہے اس کا مطلب ہے وہ خدا کے روبرو ہے ، وہ اللہ کو اپنے قریب محسوس کر رہا ہے تو یہ مقصد ہے کہ اس راہ سے آدمی کی پیوریفیکیشن ہو جائے ، کچھ اتنی صفائی ہو جائے کہ جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی اپنی زبان میں ترجمہ فرمایا کہ ، اپنی زبان میں آسان فرما کر اپنی حدیث پاک میں ارشاد فرماتے ہیں " اس پر یہ بات اعتراض کے ہمارے دلوں میں کھب جائے اور ایسی کھبے کہ ہمیں اُس پر عمل نصیب ہو جائے "۔ اگر یہ نہ ہو تو آپ دیکھتے ہیں کہ معاشرے میں کتنی تبلیغ ہوتی ہے ۔ کتنے جلسے ہوتے ہیں کتنی تقریریں ہوتی ہیں کتنے اخبار چھپتے ہیں ، کتنے رسالے شائع ہوتے ہیں ، نتیجہ کیا ہے کہ جو دن طلوع ہوتا ہے وہ ہمیں پہلے سے بدتر حالت میں دیکھتا ہے ۔

لوگو ! اپنا فکر کرو ، خدا کے لیے ۔ اور اُن لوگوں کو یاد کرو جو پچھلے رمضان میں ہمارے ساتھ تھے اب کہ رمضان میں نہیں ہیں شاید اگلے رمضان تک کون کون ہوگا کہیں سے ۔ ہم ہوں گے یا نہیں ہوں گے ۔ یہ موقع دوبارہ نصیب ہوگا ، نہیں ہوگا ، تو جو خلوص ، جو صفائی دل کی ، صفائی ضمیر کی ، صفائی باطن کی ، اس ماہ مبارک میں ممکن ہے وہ ویسے ممکن نہیں ۔ کثرت سے اللہ کا ذکر کرو ، اور اللہ سے دعا کرو کہ خدایا اپنی اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سمجھنے کی توفیق عطا فرما ۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن ۔

تربیت کا مہینہ

صفحہ ۳۹ سے آگے

گویا ضمانت دی جا رہی ہے کہ سزا سے بچایا جا سکتا ہے ۔ مگر گناہ کے معاف ہونے کا ذریعہ کونسا ہے ؟ یہ تو پہلے بتا دیا کہ ایمان اور احتساب کے ساتھ رمضان کے روزے رکھو ، گناہ معاف یعنی سزا سے بری ہو گئے ۔ پھر لطف یہ کہ جرم و سزا کا پیمانہ بھی ایسا کہ صرف رب العالمین اور رحمۃ اللعالمین ہی کی شایانِ شان ہے ۔

یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ایک مہینہ کے روزے رکھو ایک مہینہ کے گناہ معاف بلکہ اعلان یہ ہو رہا ہے کہ روزے رکھو ایک مہینے کے اور گناہ معاف ہوں گے عمر بھر کے ، کیا ٹھکانہ رحمت کا اور کیا کہنا رعایت کا ۔

ع
می توانی کہ دہی اشک مرا حسنِ قبول
اے کہ دُرّ ساختۂ قطرۂ بارانی را

مگر دیکھنا صرف روزے رکھنا نہیں بلکہ ایمان اور احتساب کی شرط کے ساتھ روزے رکھنا مطلوب ہے ۔ ہے کوئی جو یہ خزانہ لوٹنے کے لئے آگے بڑھنے کی ہمت کرے

ع
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

سینٹری ویئرز

خوبصورت ٹائلز اور دیدہ زیب سینٹری ویئر

ٹائلز

باتھ ٹب

سی۔پی فٹنگز

نیز فینسی فٹنگ

کرم سرامکس لمیٹڈ

آئی۔سی۔ایل

شبیر ٹائلز

الفو

ایمکو ٹائلز

سوات سرامکس کمپنی لمیٹڈ

سینٹری ویئر کا منفرد ادارہ

ڈیسنٹ سینٹری سٹور

۱۷۴ فیروز پور روڈ بالمقابل شاہ جمال موڑ، لاہور۔

فون: ۴۱۷۲۹۳ - ۴۱۷۹۲۸

شخصیات

حضرت امام شافعی

رحمۃ اللہ علیہ

صاحبزادہ قاری کفایت احمد رتوی

حضرت امام شافعیؒ کا نام محمد تھا آپ کی کنیت ابو عبداللہ اور لقب تھا ناصر الحدیث آپ کے والد ماجد کا نام ادریس بن عباس تھا ابتداء میں آپ کے والد ماجد مدینہ طیبہ کے قریب ایک قصبے میں رہا کرتے تھے لیکن بعد میں مدینہ ہی میں رہائش اختیار کرلی آپ کا سلسلہ نسب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے یعنی محمد بن ادریس بن عباس بن شافع ابن السائب ابن جلید بن عبدیزید کے بعد دو پشتوں میں ہاشم بن عبدمناف تک پہنچ جاتا ہے اسی طرح عبدمناف پر آکر امام شافعیؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم جدی ہو جاتے ہیں آپ حضور اکرم کے دادا حضرت عبدالمطلب کی اولاد میں ہونے کے سبب مطلبی کہلاتے ہیں آپ کی والدہ یمن کے مشہور و معروف قبیلے ازد سے تھیں آپ کے آباؤ اجداد کا اصل وطن یمن تھا اس لیے آپ مطلبی ہونے کے علاوہ ہاشمی بھی تھے امام شافعیؒ کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں مختلف روائتیں ہیں اکثر راویوں کے قول کے مطابق وہ غزہ میں پیدا ہوئے لیکن ایک دوسری روائت کے مطابق یہ بھی ہے کہ ولادت عسقلان میں ہوئی جو غزہ سے تین فرسخ پر واقع ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام شافعی کی ولادت یمن میں ہوئی ہے ان تینوں روائتوں سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی پیدائش یمن کے قرب و جوار میں ہوئی لیکن نشوونما کا زمانہ غزہ اور عسقلان میں گذرا جہاں یمنی قبائل آباد تھے راویوں کا اتفاق ہے کہ امام صاحب کا سنہ ولادت ۱۵۰ھ ہے اسی سال امام ابوحنیفہ کا انتقال ہوا تھا یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ جب ایک امام نے وفات پائی اسی دن دوسرا امام پیدا ہو گیا جو ماہ رجب کا کوئی مبارک دن تھا آپ کی پیدائش کے وقت آپ کے والد ماجد ادریس بن عباس کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے جب آپ کی عمر دو سال کی ہوئی تو آپ کی والدہ ماجدہ نے یمن کا رخ کیا اور اپنے بھائی کے پاس رہنے لگیں آٹھ سال تک آپ اپنے ماموں کے زیر سایہ پرورش پاتے رہے۔ سات سال کی عمر میں آپ نے قرآن کریم حفظ کرلیا اور آٹھ سال کی عمر میں امام مالک کی مشہور کتاب "موطا" ازبر کرلی۔ جب آپ کی عمر دس برس کی ہوئی تو آپ کی والدہ نے آپ کے چچا کے پاس مکہ مکرمہ بھیج دیا تاکہ شہر میں رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کرسکیں زمانہ کے دستور کے مطابق عرب میں نسب کے متعلق جاننا ضروری سمجھا جاتا تھا اس لیے آپ کو علم الانساب کی تحصیل کے لیے بٹھایا گیا آپ کو بچپن ہی سے حصول علم کا بڑا شوق تھا۔ اور آپ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن آپ کے چچا کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی اس لیے تعلیم حاصل کرنے میں دشواریاں پیش آئیں لیکن پھر بھی اس شوق میں کمی واقع نہ ہوئی جب کوئی حدیث یا مسئلہ ہوتا فوراً ہی ہڈی پر لکھ لیتے اور اسے حفظ کر لیتے مکہ مکرمہ میں ان دنوں مشہور محدث و فقیہ مسلم بن خالد زنگی کا طوطی بول رہا تھا آپ نے شہرت سنی تو ان کے پاس پہنچ گئے۔ حضرت مسلم بن خالد امام حدیث اور مکہ مکرمہ کے بڑے مفتی تھے وہ آپ کی یادداشت، حافظہ، فہم و دانش سے بہت متاثر ہوئے اور بڑی اچھی طرح پیش آتے رہے۔ ان کی مجلس میں اکثر امام مالکؒ کا تذکرہ ہوا کرتا تھا لہذا حضرت امام شافعیؒ کے دل میں ان کی عظمت کا ایسا اثر ہوا کہ وہ ان سے ملنے کے لیے بے قرار رہنے لگے لیکن مدینہ منورہ جانا امام شافعی کے لیے بہت زیادہ دشوار تھا۔ کیونکہ ان کے پاس سفر خرچ نہ تھا آخر آپ نے کسی طرح سو دینار کا انتظام کیا اور مدینہ منورہ

روانہ ہوگئے۔ حضرت امام مالکؒ نے آپ کو خوش آمدید کہا اور آپ ان کے حلقۂ درس میں داخل ہوگئے۔

آپ نے تین سال ان کی خدمت میں گذارے اس عرصہ میں انہوں نے آپ کو اعلاً قرأت کی اجازت دیدی آپ نے حدیث نبوی، علم فقہ اور تابعین کرام کے فتاوی کے متعلق تحصیل علم کیا پھر امام مالکؒ نے آپ کی قابلیت اور ذہانت سے متاثر ہو کر فتویٰ دینے کی بھی اجازت مرحمت فرمادی۔ مکہ مکرمہ سے آپ یمن تشریف لے گئے اور قبیلہ ہذیل کے ہمراہ قیام کیا یہ قبیلہ شستگی زبان، فصاحت اور بلاغت میں بے مثل سمجھا جاتا تھا یمن میں آپ نے مختلف علوم وفنون سیکھے اور ان میں بڑی مہارت حاصل کی۔ تیراندازی میں تو آپ کو کمال حاصل تھا عرب قدیم میں سپہ گیری سے واقفیت ضروری تھی ہر شخص فنونِ جنگ کی تربیت حاصل کرتا تھا خواہ وہ عالم ہی کیوں نہ ہو اس لیے امام شافعیؒ کے لیے بھی اس طرف توجہ کرنا لازم تھا ادب اور فن لغت میں آپ کو کامل دستگاہ تھی آپ کی تحریر شستگی فصاحت وبلاغت، زبان دانی اور محاورات واستعارات کا حسین مجموعہ تھی۔ لغت کے معاملے میں تو کوئی آپ کا مدِمقابل ہی نہ تھا محاورات واستعارات کے جو معانی ومطالب آپ بیان کرتے وہ آپ کے سوا کوئی نہ کرسکتا تھا فن تاریخ میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا آپ نے عرب کی سرزمین میں آنکھ کھولی وہیں پرورش پائی، زمانہ جاہلیت کی شاعری کا مطالعہ کیا اور سرزمین عرب کی بدلتی ہوئی تاریخ پر عبور حاصل کرلیا علم ہیئت ونجوم میں بھی آپ کو کافی دستگاہ حاصل تھی لیکن بعد میں آپ نے اس علم کو خیرباد کہہ دیا اور اس کی تمام کتابیں جلادیں۔ آپ نے طب قدیم کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا آپ کا قول تھا کہ انسان دو چیزوں پر مشتمل ہے ایک جسم اور دوسری جان یا روح، علم طب کا تعلق جسم سے ہے دوسرا علم دین کا روح سے، پس علم دو قسم کے ہوئے ایک علم طب دوسرا علم دین۔ امام شافعیؒ کو علم فراست میں بھی کافی دخل تھا اس علم کے ذریعہ ایک شخص دوسرے شخص کے بارے میں ذرا سی دیر میں جان لیتا ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے ایک بار امام حمیدیؒ اور آپ مکہ سے باہر جارہے تھے راستہ میں ایک شخص ملا، امام حمیدیؒ نے آپ سے دریافت کیا کہ اس شخص کے ذریعہ معاش کے متعلق آپ کا علمِ فراست کیا کہتا ہے آپ نے جواب دیا کہ یہ شخص بڑھئی ہے یا درزی، امام حمیدی نے جب اس سے معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ وہ پہلے بڑھئی کا کام کرتا تھا اب درزی کا کام کرتا ہے اس طرح ایک اور واقعہ بتایا جاتا ہے جس سے آپ کے علم فراست کا پتہ لگتا ہے ایک دفعہ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص مسجد میں سوئے ہوئے آدمیوں میں سے کسی کو تلاش کررہا ہے آپ نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے اس سے کہلا بھیجا کہ تمہارا حبشی غلام جسے تم یہاں ڈھونڈتے پھرتے ہو۔ وہ تو قید خانے میں بند ہے اس شخص کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ اس کے سوا کسی اور کو اس کے غلام کے گم ہونے کا کوئی علم نہ تھا اور آپ نے یہاں تک بتادیا کہ وہ قید خانے میں بند ہے تحقیق کرنے پر یہ بات بالکل درست نکلی۔ امام شافعیؒ کے طلب علم کا آغاز مکہ سے ہوا۔ یہاں انہوں نے سربرآوردہ فقہا اور محدثین سے استفادہ کیا اور ایسی منزلت حاصل کرلی۔ کہ مسلم بن خالد زنگی نے انہیں فتویٰ دینے کی اجازت دیدی مگر انہوں نے اس پر اکتفا نہ کی بلکہ تلاش علم میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے جہاں امام مالکؒ کی صحبت سے فیض حاصل کیا حضرت امام مالکؒ نے ان کے لیے ایک بلند مرتبے کی پیش کش کی اور اپنی کتاب موطا کی قرأت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی

۱۷۹ھ میں جب امام شافعی جوان ہی تھے تو امام مالکؒ کا انتقال ہوگیا اس کے بعد انہوں نے حصول علم کے لیے بلادِ اسلامیہ کا سلسلہ سفر جاری رکھا۔ آپ کو بحث مباحثے اور مناظرے میں بھی کامل دستگاہ تھی، مکہ معظمہ، مدینۃ النبی یمن، شام، عراق مصر اور الجزائر وغیرہ کے سفر میں آپ نے لوگوں کو فقہی مسائل سمجھائے اور ان سے مناظرے کئے یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ان ممالک میں آپ کے اجتہادی مسائل زبان زد خاص وعام ہوگئے ایک مرتبہ ربیعہ نے آپ سے فرمایا کہ اگر کسی شخص سے رمضان کا روزہ قضا ہوجائے تو اُسے اُس کے بدلے میں بارہ روزے رکھنے چاہئیں کیونکہ رمضان کے مہینے کا ایک دن اور مہینوں کے بارہ دن کے برابر ہے آپ نے یہ سن کر فرمایا یہ فقہ ہے یا مذاق ہے اس حساب سے تو اگر شب قدر کی نماز قضا ہوجائے تو وہ ایک ہزار مہینے تک عبادت کیا کرے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ شب ہزار مہینوں سے بہتر ہے یہ جواب سن کر حضرت ربیعہؒ خاموش ہوگئے قرآن کریم کا

سمجھنا دشوار اور اس کی تفسیر اس سے بھی زیادہ مشکل ہے قرآن کریم کی تفسیر وہی کر سکتا ہے جو اس کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ عربی زبان کی لغت سے بخوبی واقف ہو اور کتاب اللہ میں جو محاورات ہیں ان کو سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ قرآن کریم میں جو رموز ہیں ان کو سمجھنے کے لیے عقل و دانش کی ضرورت ہے جو خدا نے ہر ایک کو عطا نہیں کی، امام شافعی کو تفسیر میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا آپ نے خود فرمایا ہے کہ قرآن کریم کا ایک کلمہ بھی ایسا نہیں جس کے معانی و مطالب عرب محاورات کی رو سے میں نہ جانتا ہوں۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے قول کے مطابق امام صاحب سے بڑھ کر قرآن مجید کا کوئی جاننے والا اور نہ تھا امام یونس نے امام شافعیؒ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ قرآن کریم کے نزول کے وقت موجود تھے، امام شافعی نے زندگی کی آخری سانس تک سنتِ رسولؐ کریم اور سیرت صحابہ پر عمل کیا اور علوم و فنون کی تحصیل کے ساتھ ساتھ معرفت و سلوک کی منزلیں بھی طے کیں امام صاحب کی زندگی ایک سیدھے سادھے سچے مسلمان کی زندگی تھی آپ کی نظر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال پر تھی اور انہیں اس بات کا پوری طرح علم تھا کہ کس طرح صحابہ کرامؓ تابعین، تبع تابعین اور ان کے بعد علماء و صوفیائے کرامؒ نے حضور اکرمؐ کی دی ہوئی شمع ہدایت کو روشن رکھا، اطاعت رسول کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ سختی کے ساتھ حضور اکرمؐ کے اعمال و اقوال پر کاربند رہے اور جو کام جس طرح آنحضرتؐ نے کیا اس کو اسی طرح انجام دے آپ محض احادیث بیان کرنے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ اپنی نجی زندگی میں بھی اس پر عمل کرتے تھے ایک دفعہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ یہ جو حدیث آپ نے ابھی بیان فرمائی ہے کیا آپ اس پر عمل بھی کرتے ہیں یہ سن کر امام شافعی کا چہرہ ایک دم غصے سے سرخ ہو گیا۔ اور آپ نے فرمایا جو بات صحیح حدیث نبوی سے ثابت ہو وہی میرا مذہب ہے امام شافعی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو ایک ہی درجہ میں رکھتے ہیں اس لیے کہ ان کے نزدیک علم شریعت ان دونوں کا حاصل ہے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کتاب و سنت دونوں خدا کی طرف سے ہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے اور جو کچھ کہتے ہیں وہ وحی خدا ہوتی ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ کتاب اور سنت دونوں من جانب اللہ ہیں، کتاب اللہ اور سنتِ رسول اکرمؐ کے اسباب اور طریقے جدا جدا ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام کا مسلک وہی تھا جو امام شافعی کا، رسول کریمؐ کے بعد جب کسی مسئلہ پر اختلافات بڑھ جاتے تو صحابہ کا معمول تھا کہ سب سے پہلے وہ قرآن پاک کی طرف متوجہ ہوتے اگر اس میں کوئی حکم مل گیا تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے لیکن اگر قرآن شریف میں کوئی واضح حکم نہ ملتا تو پھر رسول خدا کے اقوال تلاش کرتے تھے حضرت امام شافعی نے صحبت حدیث کے لحاظ سے حدیث نبوی کی ترتیب و تدوین کی اس ضمن میں ایسا سخت معیار قائم کیا کہ مصدقہ اور غیر مصدقہ احادیث ایک دوسرے سے جدا نظر آنے لگیں۔ امام صاحب کے قول کے مطابق حدیث نبویؐ پر عمل کرنا لازمی ہے ان کے نزدیک حدیث نبویؐ پر عمل کرنے سے انکار قرآنی احکام پر عمل نہ کرنے کے مترادف ہے امام حسین کرابیسی نے امام شافعی کے متعلق فرمایا ہم نے یہ نہ جانا تھا کہ قرآن کریم اور حدیث نبوی کو کس طرح سمجھا جائے ہم نے قرآن و حدیث کو سمجھنے کا طریقہ امام صاحب سے سیکھا ہے امام شافعی حدیث نبوی کا کتنا احترام کرتے تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے فرمایا کسی آدمی کے کہنے سے حدیث نبوی کو ترک نہ کرنا اور اگر میرا کوئی عمل احادیث کے خلاف ہو تو میرے قول کو ترک کر دینا اور حدیث نبویؐ پر ضرور عمل کرنا صحیح احادیث معلوم کرنے کے لیے امام شافعی نے دور دراز کے مقامات کے سفر کیے مصائب برداشت کیے اور مختلف مقامات پر قیام کیا، مختصر یہ کہ امام شافعی طالب حق تھے اور جب تک اپنی رائے کو حق و صداقت کی کسوٹی پر پرکھ نہ لیتے ہرگز مطمئن نہ ہوتے تھے اس لحاظ سے امام شافعی کو ایک اعلیٰ پایہ کا محقق اور جید عالم قرار دیا جاتا ہے

امام صاحب نے مختلف استادوں سے علم حاصل کیا ان کی تعداد ۹۱ بتائی جاتی ہے جن میں ۵ مکی، ۶ مدنی، چار یمنی اور چار عراقی تھے۔

سفیان بن عیینہ، مسلم خالد بن زنگی، سعید بن سالم القداح، داؤد بن عبدالرحمان العطار، عبدالحمید بن عبدالعزیز بن ابی زواد۔

مالک بن انس، ابراہیم ابن سعد اللہ انصاری، عبدالعزیز بن محمد الداوردی، ابراہیم بن ابی یحییٰ، الاسامی۔ محمد بن

سعید ابی فریک، عبداللہ بن نافع الانصاری، مطرف بن مازن، ہشام بن یوسف، قاضی صنعاء، محمد بن ابی سلمہ، یحیٰ بن مسعود، وکیع بن الجراح، ابواسامہ حماد بن اسامہ اسماعیل بن علیہ، عبدالوہاب بن عبدالمجید، آپ کی تصنیف کافی ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

کتاب الدم، اختلاف الحدیث، احکام القرآن، رسالہ قدیم، رسالہ جدید، جماع العلم، ابطال الاستحسان، بیان الفرض، منفعت الاسرار والنبی،

اختلاف مالک و شافعی، اختلاف عراقیین،
اختلاف محمد بن الحسن، کتاب علی وعبداللہ، فضائل قریش، کتاب السنن، کتاب المبسوط، رسالہ اصول، رسالہ بغدادی،
آپ کے شاگردوں کی تعداد بڑی ہے، زیادہ مشہور یہ ہیں۔

امام حمیدی، سلیمان بن داؤد، حرملہ بن یحیٰ احسن بن محمد اسماعیل بن یحیٰ المزنی، امام بیہقی، ابواسحاق، ابراہیم بن محمد ابوبکر محمد بن ادریس، ابوالولید موسیٰ ابوعلی الحسن الصباح۔
ابوعلی الحسین بن علی۔

ابوالقرا راسکلبی، ابوعبدالرحمٰن احمد بن محمد، امام احمد بن حنبل اسحاق بن مراہویہ، ابویعقوب بن یحیٰ، محمد بن عبداللہ۔
ان شاگردوں میں ایک گروہ تو وہ ہے جس نے مکہ میں فیض حاصل کیا دوسرے نے بغداد میں اور تیسرے نے مصر میں زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ امام شافعی ان چند لوگوں میں تھے جن میں خود پسندی تھی اور نہ برتری کا جذبہ، مناظرے کے موقعہ پر وہ کبھی غصہ نہ کرتے نہ اپنی گفتگو سے کسی کی دل شکنی کرتے تھے وہ کہا کرتے تھے میں چاہتا ہوں کہ لوگ علم حاصل کریں مجھے نہ مدح کی پرواہ نہ کسی اور طرح کی آرزو، آپ ہمیشہ سخاوت کی تعلیم دیا کرتے امام صاحب بڑے متواضع تھے امام شافعی کے معتقدین دور دور تک پھیل گئے تھے، عراق، مکہ شریف، مصر، نیشاپور، خراسان، شام اور یمن میں بکثرت پائے جاتے ہیں امام صاحب کے تین لڑکے اور ۲ لڑکیاں تھیں دو لڑکوں کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا تیسرے صاحبزادے جو زندہ رہے وہ ابوعثمان تھے لڑکیوں کا نام فاطمہ و زینب تھا امام شافعی کے سر پر کسی شخص نے گرز مار دیا تھا آپ کا سر پھٹ گیا اور بہت سا خون ضائع ہو گیا چنانچہ یکم رجب ۲۰۴ھ بعد از نماز عشاء آپ کا انتقال ہو گیا آپ کو قرافۃ الصغریٰ میں دفنایا گیا جو قاہرہ سے باہر واقع ہے آپ کا مزار شریف مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے اور متصل ہی آپ کے نام سے ایک مدرسہ بھی جاری ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

خانہ بدوش
مسلمان
یا
کافر
ایک المیہ
ایک سوال؟

جس طرح ہمارے ملک میں خانہ بدوش پھرتے ہیں نہ کسی حکومت نے، نہ کسی مولوی نے، نہ کسی پیر نے یہ سوچنے کا تکلف ہی کبھی نہیں کیا۔ یہ جو دنیا بھر پھر رہے ہیں کون ہیں؟ مسلمان ہیں کافر ہیں۔ ان کی تعداد کتنی ہے؟ یہ کھاتے کہاں سے ہیں؟ ان کے علاج معالجے کا کیا بندوبست ہے؟ ان کے بچوں کی تعلیم کا کبھی کسی نے نہیں سوچا۔ حتیٰ کہ حد یہ ہے کہ انہیں تبلیغی جماعت نے بھی آج تک نہیں پوچھا جو گھر گھر جاتے ہیں۔ انہیں بھی خیال نہیں آیا۔ آخر یہ بھی اس ملک کے شہری ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہیں شہریوں میں کسی نے شمار ہی نہیں کیا۔ ان کا گھر ہے نہ گھاٹ، نہ جائیداد ہے اب ان سے جو بات کرے گا ان کو کچھ دینا ہی پڑے گا ان سے لینا کچھ نہیں۔

(حضرت مولانا محمد اکرم)

سیلانی کے قلم سے

دیکھتا چلا گیا

ایک خبر:-
دو کالمی سرخی ہے " ایم۔ این۔ اے ہاسٹل میں بڑی بدمعاشی اور فحاشی ہو رہی ہے۔"
" حکومت اور متعلقہ وزیروں نے آپ کی بات سن لی ہے مناسب اقدامات کئے جائیں گے۔ سپیکر "
" ہاسٹل میں غیر معروف لڑکیوں کی آمد و رفت ہے " شریف " ارکان کا وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا ہے۔ صاحبزادہ فتح علی خان "

اسلام آباد (نمائندہ خصوصی) معلوم ہوا ہے کہ ایم۔ این۔ اے ہوسٹل میں طاؤس و رباب کی محفل پر قومی اسمبلی کے ایک رکن نے دوسرے رکن اسمبلی کے مہمان کی پٹائی کر دی۔ تفصیلات کے مطابق " دیر سے قومی اسمبلی کے رکن صاحبزادہ فتح اللہ خان نے مشکل کو قومی اسمبلی کی کارروائی کے دوران ایک پوائنٹ آف آرڈر پہ سپیکر سے کہا کہ ایم این اے ہوسٹل میں " ان دنوں " بڑی بدمعاشی اور فحاشی ہو رہی ہے۔ کیا حکومت کو ان تمام معاملات کا علم ہے۔ سپیکر نے ان معاملات کی تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے کہا کہ " حکومت " اور متعلقہ وزیروں نے آپ کی بات سن لی ہے اور وہ " مناسب اقدامات " کریں گے۔ بعد میں صاحبزادہ فتح اللہ خان نے نمائندہ جنگ کو بتایا کہ ہم نے صدر مملکت کی توجہ اس جانب دلائی ہے کہ گورنمنٹ ہاسٹل میں بہت سے لوگ روزے نہیں رکھ رہے اس کے باوجود کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ انہوں نے کہا ہم نے ہوسٹل کی کینٹین جبراً بند کرا دی ہے۔ ہوسٹل میں " غیر معروف " لڑکیوں کی آمد و رفت کی وجہ سے شریف ارکان اسمبلی کا وہاں ٹھہرنا محال ہوتا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا ہم نے ہوسٹل کے مینیجر اور پولیس کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا ہے۔ مگر انہوں نے اس معاملہ میں " بے بسی " کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہوسٹل کے ایک کمرے سے پچھلے کئی دنوں سے بلند موسیقی کی آوازیں آ رہی تھیں جس کی وجہ سے ان کے پڑوسی بہت پریشان تھے۔ نماز کے دوران بھی یہ آوازیں بند نہ ہوئیں تو میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کمرے میں چلا گیا جہاں میں نے دیکھا کہ ایک رکن اسمبلی اپنے ۱۵-۲۰ ساتھیوں کے ساتھ رقص میں مصروف ہیں۔ اس صورت حال سے طیش میں آ کر میں نے ان کے ایک ساتھی کو تھپڑ مار دیا۔ جس کے بعد باقی لوگ پستول نکال لائے۔ میں نے للکارا کہ میرے پاس کلاشنکوف ہے۔ جس پر وہ لوگ رفو چکر ہو گئے۔ صاحبزادہ فتح علی خان نے کہا کہ اگر متعلقہ حکام نے اس صورتحال کے ازالے کیلئے اقدامات نہ کئے تو اصلاح کے لیے ہم خود قدم اٹھائیں گے۔"

جنگ لاہور مورخہ ۳۔ رمضان المبارک۔

خبر بے شک ذرا طویل ہے مگر اس کا ایک ایک لفظ اتنا قیمتی ہے کہ بقول غالب یہ کہنا پڑتا ہے کہ ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آئے

یہ خبر جہاں حقائق و معارف کا ایک خزانہ ہے وہاں قوم کی مرگِ مسلسل کا ایک دردناک مرثیہ ہے جسکی تفصیل یہ ہے۔

(۱) عنوان پہ غور فرمایئے " ہاسٹل M.N.A میں بڑی بدمعاشی اور فحاشی ہو رہی ہے "۔ سوال یہ ہے کہ اس ہوسٹل میں رہتا کون ہے؟ جواب ظاہر ہے جب اس کا نام M.N.A ہوسٹل ہے تو اس میں یقیناً M.N.A ہی ٹھہرتے ہوں گے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے M.N.A بدمعاش اور فحش لوگ ہیں۔ اگر اس کا جواب " ہاں " میں ہے تو قوم کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے۔ کیا قوم ایسی بے حس اور اندھی تھی کہ ایسے لوگوں کو انتخاب کیا اور اگر اس کا جواب " نہیں " ہے یعنی وہ بدمعاش نہیں ہیں تو بدمعاشی کیوں کرتے ہیں۔ کیا کہیں شریف لوگ بھی بدمعاشیاں کرتے ہوئے پائے گئے یا سنے گئے ہیں۔

(۲) عنوان کی اگلی سطر ہے "ہوسٹل میں غیر معروف لڑکیوں کی آمد و رفت ہے"۔

یہ اقدام بڑا شرمناک ہے۔ کیا معروف لڑکیوں کی کمی ہے کہ انہیں چھوڑ کر غیر معروف لڑکیوں کی آمدورفت کا افسوسناک رویہ اختیار کیا گیا۔ لڑکیوں کو معروف کرانے میں ٹی۔وی نے اور اخبارات کے ہر روز کے رنگین اور بنی ٹھنی اور نیم برہنہ تصویروں کے چھاپنے نکالنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی ہے۔ ان کی ساری محنت پر پانی پھیر کے غیر معروف لڑکیوں کو ہوسٹل میں درآمد کیا جاتا ہے۔ معروف لڑکیوں کی یہ حق تلفی کیسے گوارا کی جا سکتی ہے۔

(۳) "شریف ارکان کا وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا ہے"۔

سوال یہ ہے کہ ہماری اسمبلی میں جہاں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی تقسیم پائی جاتی ہے کیا وہاں یہ بھی ہے کہ ارکان کی دو قسمیں ہیں۔ یعنی شریف ارکان اور غیر شریف یا بدمعاش ارکان۔ اگر ایسی بات ہے تو یہ کون بتائے گا کہ جو ارکان شریف نہیں ہیں وہ کس کے ووٹوں سے "برگزیدہ" یعنی منتخب قرار پائے۔

پھر اس عبارت سے یہ بھی جھلکتا ہے کہ وہ ارکان جو شریف نہیں ہیں اور جن کی کوشش سے بدمعاشی ہو رہی ہے ان کا غلبہ ہے۔ جبھی تو شریف ارکان کا وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ شریف ارکان کو گھر سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ اور انہیں "خانہ بدوشی" کی زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ یہی نہیں بلکہ اس جمہوریت کے دور میں جب ان ارکان کا غلبہ اور اکثریت ہے جو شریف نہیں ہیں تو کوئی شریفانہ قانون ہی کیونکر ہو گا۔

(۴) "ہوسٹل میں طاؤس و رباب کی محفل ہوتی ہے"۔

دیکھنا یہ ہے کہ ہوسٹل کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ طاؤس و رباب کی قدر افزائی اور پذیرائی کا یہ عالم ہے کہ سید زادیوں اور پیر زادیوں نے طاؤس و رباب کے پیشہ کو اپنا کر بڑے فخر کے ساتھ اپنے نام کے آگے پیرزادہ اور سید کا لفظ لکھتی ہیں اور میر صاحب کی بات پوری ہو کے رہی کہ

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
"جمہوریت" میں عزت سادات بھی گئی

اور اس پیشے کے لیے اہل زبان نے جو الفاظ وضع کیے تھے وہ متروک ہو گئے۔ ان کی جگہ موسیقار، اداکار، گلوکار کی تراکیب وضع ہو گئیں۔ گو سب کے لیے ایک ترکیب بدکار ہی

> حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے حضرت حسن بن علیؓ کا بوسہ لیا۔ اس وقت آپؐ کے پاس اقرعؓ بن حابس تمیمی بیٹھے تھے۔ وہ بولے: میرے دس بچے ہیں لیکن میں نے تو اُن میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ یہ سن کر نبی کریمؐ نے (حیرت سے) اُن کی طرف دیکھا۔ پھر فرمایا جو شخص رحم و شفقت نہیں کرتا اُس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

کافی تھی مگر اس سے علیحدہ علیحدہ تشخص قائم نہیں رہتا۔

پھر اس کے تقدس کا یہ عالم ہے کہ اب ثقافت کے معنی ہی ناچ اور گانا قرار پائے۔ چنانچہ یہی طائفے ثقافت کی نمائندگی کرنے کے لیے دوسرے ممالک میں بھیجے جاتے ہیں تاکہ دنیا کو بتا دیا جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ثقافت کی ترویج و ترقی و ارتقاء کے لیے ۲۳ سالہ نبوی زندگی صرف کر دی تھی۔

پھر اس پیشہ کے تقدس کا یہ عالم ہے کہ طائفے کا کوئی "امام" باہر سے آ جائے تو استقبال کے لیے میئر، گورنر اور وزیر ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایوان صدر میں ان کی ضیافتیں ہوتی ہیں۔ اور اس پیشے کے فنکاروں کو صدارتی ایوارڈ ملتے ہیں۔ اس لیے ہم تمہاری کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تمہیں ایوارڈ عطا کرتے ہیں۔ لہٰذا جب ہوسٹل سے باہر یہی کچھ ہو رہا ہے تو ہوسٹل کے اندر ہونے میں قباحت کیا ہے۔

(۵) صاحبزادہ فتح اللہ خان نے سپیکر سے کہا ۸۸/۲/۸ ہوسٹل میں "ان دنوں" بڑی بدمعاشی اور فحاشی ہو رہی ہے۔ "یہ ان دنوں" کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ یہ دن کون سے خاص دن ہیں؟ ہاں یہ رمضان المبارک کے دن ہیں۔ بڑے مبارک دن ہیں نہایت مقدس دن ہیں۔ عبادت کا موسم ہے۔ لہٰذا "ان دنوں" میں بدمعاشی نہیں ہو سکتی۔ بات کوئی اور ہے اور بات راز کی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ارکان اسمبلی ان مبارک دنوں میں عملاً یہ عبادت کر کے اپنے آپ کو تیار کر رہے ہوں۔

(۶) صاحبزادہ صاحب نے بتایا کہ ہم نے صدر مملکت کی توجہ اس جانب دلائی ہے گورنمنٹ ہوسٹل میں بہت سے لوگ

روزہ نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود قدم نہیں اٹھایا گیا" صاحبزادہ صاحب بھی بڑے بھولے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ صدر صاحب صدر مملکت ہیں، کوئی تھانیدار نہیں۔ ان کی یہ قربانی تھوڑی ہے کہ صدارت کر رہے ہیں۔ ان پر مزید کوئی بوجھ ڈالنا کہاں کا انصاف ہے۔

البتہ تعجب اس بات پر ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے صدر صاحب کی توجہ " اس بدمعاشی " کی طرف کیوں نہ مبذول کرائی جو اس جز کا عنوان ہے۔ ممکن ہے انہوں نے یہ سوچا ہو کہ ایسی گندی بات اسلام مجسم صدر صاحب سے کیوں کہی جائے۔

(۷) انہوں نے کہا " ہم نے ہوسٹل کی کینٹین جبراً بند کرا دی ہے۔" ظاہر ہے کہ وہ جمہوری طریقے سے کینٹین بند کرا ہی نہیں سکتے تھے جبھی تو "جبر" کا ہتھیار استعمال کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوری طریقے سے یہاں نہ تو اسلام آ سکتا ہے نہ فسق و فجور مٹ سکتا ہے۔ یہ کام جب بھی ہو گا ڈنڈے کے زور سے ہو گا۔

(۸) انہوں نے کہا "ہم نے ہوسٹل کے منیجر اور پولیس کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا ہے۔ مگر انہوں نے اس معاملہ میں "بے بسی" کا اظہار کیا ہے۔"

منیجر کی مجبوری اور بے بسی سے تو ہم واقف نہیں البتہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ پولیس واقعی بے بس ہے اس کا بس چلتا ہے تو صرف شریف آدمیوں پر، بدمعاشوں پر تو پولیس کو بیحد رحم آتا ہے اور اسی جذبہ کے تحت بے بس ہو جاتی ہے۔ یقین نہ آئے تو کراچی کے حالات دیکھ لیجئے، غنڈوں تخریب کاروں اور فسادیوں کو کتنی شفقت سے سرحد پار پہنچا دیا۔ پھر کراچی کے واقعات کا مطالعہ کیجئے۔ علماء پر اتنا کیسا بس چلتا ہے۔ پولیس نے ان کی تواضع کی اس معاملہ میں انکی بے بسی میں کوئی نادان ہی شک کرے۔ پولیس کی بے بسی کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ پولیس کی ذمہ داریاں اب کے بہت بڑھ گئی ہیں رات کو وردی اتار کے ڈاکے ڈالنے ہوتے ہیں۔ اور دن کو وردی پہن کر ڈاکوؤں کی تلاش کرنی ہوتی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی تلاش ہے۔

(۹) " ایک کمرے سے موسیقی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نماز کے دوران بھی یہ آوازیں بند نہ ہوئیں۔"

کاش صاحبزادہ صاحب نے اکبر کا کلام ہی پڑھا ہوتا اس عقدہ کا کیا عمدہ حل بتا گیا ہے۔

کیسی نماز ہال میں ناچو جناب شیخ!
تجھ کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا

کیا صاحبزادہ صاحب کو علم نہیں کہ قوم آزاد ہو گئی۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئیں اور قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ اقبال نے بیان کیا تھا۔ قوم نے اسے غلط ثابت کر کے دکھا دیا اور اعلان کر دیا کہ ؎

آ تجھ کو بتائیں ہم تقدیر امم کیا ہے
طاؤس و رباب اول طاؤس و رباب آخر

قوم نے تو ساری قدریں ہی بدل کر رکھ دی ہیں حتی کہ عاشق کے انداز بھی بدل گئے۔ اور آج عشاق کی ہجر کی راتیں یوں کٹتی ہیں کہ

؎ آپ کی فرقت میں کل رات بھر سویا نہیں
لیکن اتنی بات تھی گاتا رہا رویا نہیں

لہٰذا گانا تو اب قوم کی غذا ہے۔ آپ قوم کو بھوک کی مار دینے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔

(۱۰) " ایک رکن اسمبلی اپنے ۱۵، ۲۰ ساتھیوں کے ساتھ رقص میں مصروف تھے۔"

صاحبزادہ صاحب نے حد کر دی۔ رکن اسمبلی اور رقص! یہ کیا جوڑ ہے۔ دور غلامی میں رقص کرنے والی کو کنجری کہتے تھے۔ تو کیا رکن اسمبلی کوئی وہ تھے، جس کا نام اب بڑا مہذب اور پر کشش ہے۔ کیا قوم نے ارکان اسمبلی کے انتخاب میں یہی وصف پیش نظر رکھا کہ کون اچھا ناچتا ہے۔ کون اعلیٰ درجے کا بھانڈ ہے۔ اگر قوم نے ایسا کیا تو ظلم کیا اور اگر ایسا نہیں کیا تو یہ برگزیدہ "حضرات کیسے منتخب ہو کے آ گئے۔

(۱۱) آپ نے کہا "اس صورتحال میں طیش میں آ کر میں نے ان کے ایک ساتھی کو تھپڑ مار دیا۔"

طیش میں آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ صاحبزادہ صاحب کو جذبات پر کنٹرول نہیں۔ دین کی رسوائی دیکھ کر طیش میں آنا تو رواداری کے بالکل منافی ہے۔ صاحبزادہ صاحب جانتے نہیں کہ اسلامی مملکت ہے اس میں اسلام نافذ ہو رہا ہے اس لیے دین کے معاملے میں جب تک ارکان مکمل طور پر بے غیرت نہ ہوں اسلام نافذ ہو ہی نہیں سکتا۔ تھپڑ مارنا تو اور بھی بڑی زیادتی ہے۔ تہذیب کا تقاضا تو وہ ہے جو

اکبر نے بیان کیا تھا کہ ؎

شیطان کو رجیم کر دیا تھا اک دن
اک شور اٹھا خلاف تہذیب ہے یہ

(۱۲) انہوں نے کہا "اس کے بعد لوگ پستول نکال لائے میں نے للکارا میرے پاس کلاشنکوف ہے جس پہ وہ لوگ رفوچکر ہو گئے۔"

خدا لگتی کہئے آپ نے کبھی سنا کہ ناچنے والوں۔ بھانڈوں اور کنجروں کے پاس بھی پستول ہوتے ہیں۔ یہ رکن اسمبلی کا کمال ہے کہ آگ پانی کو ملا کے دکھا دے۔ ناچے بھی اور پستول بھی پاس ہو۔ ضرورت پڑے تو اس کا مظاہرہ بھی کرے۔ کیونکہ رکن اسمبلی کو اسلام نافذ کرنا ہے۔ اسلام بھلا آسانی سے نافذ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ کلاشنکوف کا نام سن کر پستول اور پستول والے ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ یعنی جمہوریت سے کام نہیں چلتا۔ کلاشنکوف ہی کوئی عقدہ کشائی کرے تو کرے۔

(۱۳) اس خبر نے جہاں یہ بتا دیا کہ دینی اعتبار سے یہ قوم نیچے سے اوپر تک

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

وہاں اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں کیلئے ایک سبق ہے کہ ذرا اپنا میٹیریل تو دیکھو۔ کس سے مطالبہ کرتے ہو کہ اسلام نافذ کرو۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ پنجابی کی ایک کہاوت ہے۔ "اٹھ کھڑ باجیاں نپنے گئے"۔ یعنی اونٹوں سے مطالبہ کیا جا رہا ہے قلا بازیاں لگاؤ۔

یہ رمضان میں طبیواؤں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے والے "یہ ناچنے اور بھانڈ" اسلام نافذ کریں گے۔ ان لوگوں سے اسلام کا مطالبہ بڑی سادگی ہے۔ میر نے سچ کہا۔ ؎

میر سادہ ہیں کہ بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

رہی قوم اور جمہوریت تو اس کا معیار انتخاب سامنے ہے یوں لگتا ہے جیسے اقبال ایک حقیقت تابندہ بیان کر گیا ہے کہ ؎

بخاک "پاک" نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نہ گردد ز نغمۂ داؤد

(۱۴) صاحبزادہ صاحب نے جس المیے کی نشاندہی کی ہے یہ وہاں ہو رہا ہے۔ جس کے پہلو فلک بوس عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن چکی ہے۔ جہاں انسانی نعشیں فضا میں بکھری نظر آتی ہیں۔ جہاں آگ برس رہی ہے۔ جہاں چیخ و پکار ہے۔ جہاں انسانیت کراہ رہی ہے۔ جہاں بیٹھے ہوئے سامنے شعلے اٹھ رہے ہیں دھواں پھیل رہا ہے۔ آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو رہی ہیں یہ قوم کے لاڈلے، یہ بے حس لوگ، یہ چلتی پھرتی لاشیں۔ یہ ننگ انسانیت، قوم کے لیے ایک بوجھ۔ دین کے لیے ایک تہمت، اور انسانیت کے لیے عار۔ اس عظیم بربادی پہ رنگ رلیاں منا رہی ہے، جشن ہو رہے ہیں۔

'آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں'

تم نے اسلام کا نام لے کر اسلام کو رسوا کیا۔ تم نے مسلمان کے دعویٰ کے ساتھ دین کو مٹانے کے سامان کیے۔

'ڈر اسکی دیر گیری سے کہ سخت ہے انتقام اس کا'

اس سادگی پہ

دارالعرفان حاضری دی مولانا مزیدار آدمی ہیں بہت سے لوگوں کے شیخ ہیں ظاہر ہے انہیں بے پناہ عقیدت ہوگی مگر ہمارے دوست ہیں اور ہمیں ان سے بے پناہ محبت ہے عقیدت اور محبت میں ایک لطیف سا فرق ہے عقیدت بے تکلف نہیں ہونے دیتی بلکہ محبت میں سرے سے کوئی تکلف نہیں ہوتا اور جہاں تکلفات ہوں وہاں محبت نہیں ہوتی اس لیے حضرت کے عقیدت مندوں سے امید رکھتا ہوں کہ میری بے تکلفی کو گستاخی جان کر خفا نہ ہوں۔ یہ محبت کی بے تکلفی ہے ورنہ یقیناً میں ان کی محبت پہ نثار ہو سکتا ہوں۔ سربازار ریک سکتا ہوں دریار پہ رسوائی قبول پس دیوار کا گریہ منظور مگر تیچھے ہٹنا تو میرے بس میں نہیں رہا۔

میں بھی آپ کو کہاں لے گیا خیال تھا ایک ہلکا پھلکا مزیدار سا خاکہ لکھوں گا مولانا ہنسیں گے تو میں اپنے لکھنے کی داد پا لوں گا۔

آپ کے عقیدت مند خوش ہوں گے

تو سنئے اور ہمارے انتخاب کی داد دیجئے' پہلی بات یہ ہے کہ مولانا کے پاس روئے زمین سے ڈاک آتی ہے اور شاید اسرائیل کے علاوہ کوئی ملک ایسا نہیں جہاں سے خطوط نہ آتے ہوں کیونکہ ان کی نسبت اب روئے زمین پر پھیل چکی ہے اور ہر ملک میں کوئی نہ کوئی دل اس سے روشن ہے اللہ اللہ کرتا ہے پھر وہ انہیں خط بھی لکھتا ہے کہ راہنمائی چاہتا ہے مگر بعض لوگ صرف دنیا کی ضروریات کے لیے لکھا کرتے ہیں اور ان کے ہاں ایسے خطوط کی بھی کمی نہیں اور یہ دیکھا گیا ہے کہ سب کو جواب ضرور دیا جاتا ہے خواہ چند سطور ہی کیوں نہ ہوں مگر بعض خطوط لاجواب بھی ہوتے ہیں ان ہی میں سے ایک یہ بھی ہے جس کا تذکرہ میں آپ سے کرنے چلا ہوں لاجواب اس لئے لکھ دیا کہ ایسے خطوط کا کوئی جواب دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر آپ ان کے مطالبہ پر دُعا کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں کوئی نازنین اس عذاب کا شکار ہوتی ہے تو حشر کے روز آپ کو معاف نہیں کرے گی ہرگز ہرگز نہیں بلکہ شاید دوسرے گناہ بخشوانے کی کوئی حیلہ شکل ہی آئے مگر اس سے چھٹکارا مشکل اور اگر آپ بڑے میاں کو سمجھانا چاہتے ہیں تو وہ اس مقام سے گزر چکے کہ اگر گنجائش ہوتی تو ایسا لکھتے ہی کیوں بہرحال مولانا تو پڑھ کر خاموش ہو گئے غالباً انہوں نے اس بزرگ کے لیے صبر کی دُعا ضرور کی ہوگی میں نے لب ہلتے تو دیکھے تھے الفاظ نہ سن سکا اب آپ کو وہ خط کی عبارت بھی سنوا دوں مگر ٹھہریے ایک بار سکول میں فلسفہ کی تعریف کسی استاد سے سنی تھی انگریزی زبان میں تھی جس کا ترجمہ کچھ یوں بنتا ہے کہ فلسفہ ایک سیاہ بلی کو تاریک رات میں اندھیرے کمرے میں تلاش کرنے کا نام ہے جو وہاں ہے نہیں۔ [illegible] دراصل اس ساری بات کا مزہ آخری جملے میں ہے۔ کچھ یہی حال اس خط کا ہے لکھنے والے ڈاکٹر ہیں اور یقیناً موروثی ڈاکٹر ہوں گے ایک بار ڈرامے میں دیکھا تھا کسی پڑھے لکھے ڈاکٹر نے مریض کی حالت نار دیکھ کر معالج ڈاکٹر سے پوچھ لیا تھا کہ آپ نے کس میڈیکل کالج میں پڑھا ہے تو انہوں نے بڑے طمطراق سے فرمایا کہ پڑھو تم لوگ جن کے خاندان میں کوئی ڈاکٹر نہیں۔ یہاں میرا باپ ڈاکٹر، دادا ڈاکٹر، پڑدادا ڈاکٹر، مجھے کسی کالج میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت، موصوف کا بخاری میڈیکل ہال بھی ہے پتہ نہیں اس کی نسبت بخارا کی طرف ہے یا بخار کی طرف۔ بہرحال تو القاب و آداب کے بعد جو انہوں نے لکھا ہے پیش خدمت ہے۔

اوّل تو بہت ادب و احترام' محبت شفقت کا اظہار' پھر شوقِ ملاقات' اس کے بعد نوٹ لکھتے ہیں۔ یاد رہے باہر لکھا ہے نوٹ :- اور آگے ضرور پڑھیے اب تو آپ کو بہت شوق پیدا ہو گیا ہو گا کہ یہ نوٹ کیا ہے بھئی بہت قیمتی ہے حکومت نے ایک ہزار کا نوٹ چھاپ کر بڑا تیر مارا مگر ایسے نوٹ تو لاکھوں میں نہیں ملتے تو پڑھیے۔

نوٹ :- میری خواہش ہے کہ آپ کے ملاقات پیر ہیں آپ' دونوں مل کر اللہ تعالےٰ کے لیے سربسجود ہو کر دعا کریں۔ کہ مجھے خدا ایک نیک بخت خوب صورت بیوی عطا کریں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ شادی کروں مگر نہیں ملتا' یہی جواب ملتا ہے کہ سفید داڑھی ہے۔

ہائے رے زمانے کی ناقدر شناسیاں داڑھی اور پھر سفید جو بہت زیادہ قابلِ احترام ہونا چاہیے تھی لوگ اسی سے خفا ہوتے ہیں یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے ویسے فلسفے کی تعریف کی طرح یہ آخری جملہ مزہ دے گیا اللہ کریم ایسے کرداروں کو سلامت رکھے جو غم ہلکا کرنے کا باعث بنتے ہیں اور مسکراہٹیں لٹاتے ہیں اب انصاف قارئین پر ہے بزرگ کے لیے صبر و ہدایت کی دُعا کرتے ہیں یا کسی نیک بخت خوب صورت عورت کے لیے سزا تجویز ہوتی ہے اپنا کیا ہے ہم نے تو معاملہ آپ احباب پہ چھوڑا ہے۔ دیکھیں از غیب چہ آید بیروں۔

سیماب اویسی

کیا آپ ماہنامہ المرشد باقاعدگی سے پڑھتے ہیں

المرشد باطنی اصلاح کیلئے گھر کے ہر فرد کے پڑھنے کیلئے ہے، المرشد صحت مند سوچ و فکر کی زندہ علامت ہے

صرف ۷۵/- روپے میں ۱۲ شمارے بمعہ ڈاک خرچ

خط و کتابت کے لیے ؛ ادارہ نقشبندیہ اویسیہ دارالعرفان، منارہ، ضلع چکوال